Regd. L. No.7243 Phone. [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1975

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدل اشتراک
(۱ ½) ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان سالانہ ـــــ پندرہ روپے غیر ممالک سالانہ ـــــ ڈیڑھ پونڈ
نمبر ۴	اپریل ۱۹۷۵ء	جلد ۲۸

فہرست

(۱) نذرِ عقیدت بحضور رسالتمآب ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۲

(۲) معمارانِ پاکستان ـــــ ۹

(۳) لاہوری احمدیوں سے صرف دو سوال پوچھیے ـــــ ۲۱

(۴) وفاقی حکومتِ پاکستان وضاحت کرے ـــــ ۲۳

(۵) تصوف ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۲۵

(۶) سرخیلِ نغمہ زاراں ـــــ ۴۴

(۷) روحانی بزرگ بننے کا آسان نسخہ ـــ (شاہد عادل) ـــــ ۵۰

(۸) مجلسِ مذاکرہ (طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۴ء) ـــــ ۵۷

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مہتمم طباعت: نواز احمد۔ مطبوعہ: علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریبِ سعید عید میلاد النبیؐ

نذرِ عقیدت بدرگاہ حضور رسالتمآبؐ

(پرویز)

(۱) وہ آئے بزم میں ......

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان، ادھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و نا امید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس ربِ ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ شرافت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک سوتے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جان بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اقدس و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، ناسوت و لاہوت یداللہ و توجیہہ کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ روحانی اور حکمتِ ربانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں

غیب وشہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ نوامیسِ فطرت نے "جنت سے نکلے ہوئے ابنِ آدم" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس وتحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا کے طاغوتی قوتوں کے تحت الثریٰ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت وقیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا، نار کی جگہ نور سے معمور ہوگئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہوگئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور واستبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہوگئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا ـــــ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال وسلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔ احبار ورہبان کی برہمنیت کے طوق و سلاسل، قیصر وکسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی عطا ہوا۔ اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ:

محبت از نگاہش پایدار است ‏ سبو کش عشق ومستی را عیار است

مقامش عبدہٗ آمد و لیکن ‏ جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ (معراجِ انسانیت، طبع اول صفحہ ۱۷۱۔۱۷۲)

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

جب مشیتِ ایزدی کی تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین وآسمان یوں تو ہزاروں قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مدھم روشنی میں کوثر وتسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل وگہر کو سمو لے، تو آسمان کی حوریں زمین پر آئیں کہ جنت کے تر وتازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی سرزمین کو آرائش کر دیں۔ صحنِ گلستانِ کائنات میں بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی

فلک تعظیم کے لئے جھکا - زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا - صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے - بلد آمین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبل تیمن پر حضرت نوحؑ نے ارشاد کیا تھا اور جسے کوہ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہ تسکین خاطر بتایا تھا - جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طور سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیل اکبرؑ اور ذبیح اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا - وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں آیا' اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے - فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا - سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا - ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا - کائنات کے ذرّے چمک اٹھے - فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ

اے سوادِ ابطحِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں — تو صلوٰۃِ صبح تو بانگِ اذاں

(معراج انسانیت طبع اول صفحہ ۱۷۳ - ۱۷۴)

مقامِ محمدی

یہ آنے والا رسول کافۃً للناس اور رحمۃ اللعالمینؐ بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا - یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی صداقت جہاں کہیں بھی تھی اس کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی - روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی - مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کی رہین منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخرالزمانؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا -

پیغامِ محمدی کیا ہے ؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا - اور

مقامِ محمدی کیا ہے ؟

ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی فرطِ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا - وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' اور یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا - وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں یہ ایک

اسلیے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خط مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوش جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیکھنے سننے والا پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

(معراج انسانیت طبع اوّل صفحہ ۱۷۵)

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى

طلسم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے

قلبِ وادیٔ فاران (یعنی ام القریٰ مکہ) اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ، ہر عاکف و باد کے لیے مرکز قلب و نظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ زارِ حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حرمِ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے طفلک و برنا و پیر، نزد و دور، کاروان در کاروان اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لئے، دواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز جذبہ ہائے تعبد سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر اسفار ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے انکا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام و سبو کے اشتیاق زاست مشّارہ ہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنجِ گراں نشیں کے جگر سوز

انسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعراء کے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے طرۂ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفلِ عیش و طرب ہو یا میدان جنگ و جدال ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہ اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر یوں مستغرق ہوتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد، عورت، سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہیں گویا یہ چیزیں ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

ایک استثناء

لیکن مکہ کی ان پرہجوم گلیوں میں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریق احسن کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کچھ خلا سا محسوس کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب، جو اس کی قوم کا جزوِ زندگی بن چکے ہیں، اس کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجود رقصاں لے کر حرم تک جاتا ہے لیکن وہ ان گوہر ہائے تابندہ کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی کوئی چوکھٹ اس متاعِ گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتی۔ جب وہ انسانوں کی گردنوں کو ان کی اپنی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ——— یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے!

وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے، لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے اعمال کو کوئی دخل نہ ہو وہ باعثِ فخر و تکبر ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کی فطرتِ سلیم اِبا کرتی ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے جلیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں

تلاشِ حقیقت

وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصل روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی جھنجھلا کر اٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اسے تلاش

ہے۔ لیکن اسے ان کا ذوق تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ :-

در میخانۂ اے ساقی ندارم محرمے دیگر کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

تفکر و تدبر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر نگاہ اسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و تفکر دیتی ہے اور گاہ ماہ و آفتاب کی درخشندگی اس کے لئے سامان تدبر و تفحص پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہر فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آ گیا؟ کون اسے ایسی حسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط آتا ہے کہ وہ اس کاوش اضطراب کو اپنے معمولات و زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، اہل بچوں کی نگہداشت، رفقاء و احباب سے میل ملاقات، معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا۔ اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیرکٹر کی بلندی کے مداح ہیں۔ اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قوم اور خاندان کو اس کی شرافت و اصالت پر ناز ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے اس لئے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لئے وجہ اطمینان اور موجب تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پاتا ہے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے۔ کارلائل کے الفاظ میں۔

"شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہیئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے - ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا - ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی وحی سے ملتا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنالے۔

HEROES AND HEROE-WORSHIP P. 49

ہاں، ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا - ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا - اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا[1] یہی کیفیت قبل از رسالت حضورؐ کی تھی . . . .

(معراج انسانیت طبع اوّل صفحہ ۱۸۷ - ۱۸۸)

[1] اس کے بعد حضورؐ شرفِ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے۔

سلہ نبوت خالصتہً خدا کی موہبت ہوتی تھی جس میں ہونے والے نبی کے اپنے ملکہ یا کسب وہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ خدا جس ذات کو اس منصب جلیلہ کے لئے منتخب کرلیتا تھا، اسے اپنے پروگرام کے مطابق، ایک وقتِ معینہ پر نبوت عطا کردیتا تھا یہی وجہ تھی کہ نبی کو قبل از نبوت، وحی کا علم نہیں ہوتا تھا - (حضورؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا)

(پرویز)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار - صبح ۹ بجے
بمقام ۲۵ بی - گلبرگ ۲ - لاہور
ٹیلیفون (۸۰۸۰۰)

لائلپور میں
بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) ۵½ بجے سہ پہر
بمقام - دفتر بزم طلوعِ اسلام - ۶۵ کوتوالی روڈ
متصل حیات سرجیکل کلینک - رابطہ کیلئے

ملتان میں
بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
۴ بجے بعد نماز جمعہ - بمقام دفتر
شاہ سنز بیرون پاک گیٹ ملتان

سیالکوٹ میں
ہر اتوار صبح ۹ بجے
(بذریعہ ٹیپ) - چوہدری محمد دین ولد کمال دین -
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام -
محمد دین ٹی سٹال - کرسچین ٹاؤن - بارہ پتھر سیالکوٹ

کراچی میں
ہر اتوار - صبح ۱۰ بجے - (بذریعہ ٹیپ)
بمقام - دفتر بزم طلوعِ اسلام - دار القائد
۲۰-۱/بی بس سٹاپ - ناظم آباد ۳ - کراچی ۱۸
فون - (۶۱۰۴۶۸)

راولپنڈی
(بذریعہ ٹیپ)
ہر جمعہ ۵ بجے سہ پہر
بمقام - جے ۱۶۶
لیاقت روڈ - راولپنڈی

کوئٹہ میں
ہر اتوار ۳½ بجے بعد دوپہر
(بذریعہ ٹیپ) بمقام - ۲۸ گوردت سنگھ روڈ
کوئٹہ
فون (۷۰۰۷)

واہ میں
(بذریعہ ٹیپ)
بعد نماز جمعہ - بمقام
۱۵ - جہلم روڈ - واہ - WAH

معمارانِ پاکستان

[جناب "حق شناس" کے قلم سے یہ مقالہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے اب (پرویز صاحب کے اضافہ کے ساتھ) دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی اہمیت اور دوبارہ اشاعت کی وجہ اضافہ سے معلوم ہو جائے گی۔ طلوعِ اسلام]

غالباً ۴۳-۱۹۴۲ء کا ذکر ہے، میں سرحد کے مضافات میں اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیر تلاش کر رہا تھا۔ وہ مضافات جو عمر بھر میرے تصورات کی آماجگاہ اور مستقبل سے متعلق میری امیدوں کا محور بنے رہے تھے۔ میں جوں جوں وہاں بسنے والے آہنی انسانوں کی فطرت و نفسیات کا مطالعہ کرتا، مجھ پر عجیب و غریب راز منکشف ہوتے چلے جاتے۔ سب سے زیادہ تحیر انگیز ان کے سیاسی شعور کی بیداری تھی۔ ان دور دراز مقامات میں جہاں شاید ہی کبھی کوئی اخبار پہنچتا ہو، ہل چلانے والے کسان اور گدھے ہانکنے والے دہقان، مقامی، ملکی، بین الاقوامی اور اسلامی سیاست سے متعلق اس قسم کے سوالات پوچھتے کہ ہمارے شہروں کے اچھے اچھے لیڈروں کے ذہن میں بھی نہ آسکیں۔ پھر وہ بات کو سمجھتے اس سرعت سے کہ فقرہ آغاز سے فوراً مآلِ کار تک پہنچ جاتے۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ حیرت افزا ایک اور "آواز" تھی جو ہر مقام اور ہر گوشے سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے جس سے بات کی اس نے کہا کہ "ہاں۔ صدر صاحب نے بھی یہی کہا تھا" "صدر صاحب کا بھی یہی فیصلہ ہے"... "ہم صدر صاحب سے پوچھ کر بتائیں گے"! میں حیران تھا کہ یا اللہ یہ صدر صاحب کون بزرگ ہیں جن کے ذکر سے ساری فضا معمور ہے۔ میں یونہی پھرتا پھراتا ایک دن اپنے میزبان کے ہمراہ ایک جرگہ میں جا پہنچا۔ ایک بڑا اہم مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ مخالف و موافق سمت سے شعلہ فگن تقریریں ہو رہی تھیں، ہر پٹھان کے پاس اس کی رائفل یا چھوٹے اور کارتوسوں کی پیٹی کمر سے بندھی ہوئی۔ محفل میں اس قدر شدید حرارت پیدا ہو گئی کہ مجھے اندیشہ ہو گیا کہ اب یہ پٹھان "حسبِ عادت" "مقابلے" پر اتر آئیں گے اور فریقین میں گولی چل جائے گی۔

میں نے ایک پاس بیٹھے ہوئے بڈھے پٹھان سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ اس نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ "وہی ہوگا جو صدر صاحب کہیں گے"! اب میری تمام حیرت سمٹ کر نگاہوں میں آگئی کہ بالآخر آج ان صدر صاحب کو دیکھ سکوں گا جن کے تذکروں سے ساری فضا معمور تھی۔ آخری مقرر کی تقریر کا دھواں ابھی فضا میں گم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک گوشہ میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ساری محفل پر سناٹا

چھا گیا۔ ہمہ تن آتش پٹھان، افغانی " کاشمیری" بن گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھ فٹ سے بھی اونچا، تنومند، قوی ہیکل، انسان جھٹکا دے کر اٹھا اور نہایت متانت سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجمع میں سے ہر شخص کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز تھیں۔ سر پہ دہقانی ٹوپی تھی اور ایک چھوٹا سا پٹکا یونہی بے ترتیبی سے لپٹا ہوا۔ چوڑا چکلا چہرہ، سرسید جیسی داڑھی، عقاب کی سی چمکدار، روشن آنکھیں۔ لبوں پر ایک معصومانہ مسکراہٹ۔ پنڈلیوں تک ایک لانبا کرتا اور اسی کپڑے کا دو ورودہ "راشنوں"[1] والا شلوار۔ ایک[2] چادر، یونہی ادھر ادھر شانوں سے لٹکتا ہوا۔ کرتے پر ایک صدری، جس کا ایک جیب توشہ دان اور دوسرا لیٹر بکس دکھائی دیتا تھا۔ یہ تھے "صدر صاحب" جن سے میں اتنے دنوں سے ہر گاؤں اور ہر قریہ میں غائبانہ طور پر متعارف ہوتا چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے مجمع پر ایک خاموش، لیکن نہایت پر معنی نگاہ ڈالی۔ اور اس کے بعد نکھری اور سلجھی ہوئی پشتو میں تقریر شروع کی۔ میں محو حیرت تھا کہ سرحد کے کسی ویرانے میں بیٹھا ہوں یا لندن کی پارلیمنٹ میں۔ ایک دہقانی پٹھان" کو سن رہا ہوں یا چرچل اور ہٹلر کو (اس زمانہ میں ہٹلر کی تقریروں کی بڑی دھوم ہوا کرتی تھی) تقریر میں بین الاقوامی سیاسیات کا تجزیہ، ہندوؤں کی نگاہِ فریب و سیہ کاریوں کی نقاب کشائی، تحریک قومیت پرستی کی ابلہ فریبیوں کا کچا چٹھا۔ مسلم لیگ کے خلاف اعتراضات کے جوابات سیاست حاضرہ میں اسلامی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی، سب کچھ آ گیا اور اس مؤثر انداز سے کہ سامعین میں سے کوئی اونچی سانس تک نہیں لیتا تھا۔ تقریر میں کہیں بجلی سی کڑک اور بادلوں کی سی گرج تھی اور کہیں ندی کی بے صوت نغمہ خوانیاں اور پر سکوت روانیاں۔ اس تقریر کے بعد۔ اس مغنی، آتش نفس نے مجمع سے پوچھا کہ کہو آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ فیصلہ کیا تھا؟ وہی جو مجھ سے اس بڈھے پٹھان نے کہا تھا۔ کسی ایک اختلافی آواز کے بغیر متفقہ طور پر سب نے اس پر صاد کیا جو صدر صاحب نے کہا تھا۔

رات کو میں نے کھانے کے بعد اپنے میزبان کو اٹھنے نہ دیا اور ان سے کہا کہ خدا کے لئے مجھے بتایئے کہ یہ صدر صاحب کون ہیں۔ انہوں نے خشک پشاوری تمباکو کا ایک لمبا سا کش لگایا اور حقہ کو اٹھوا کر میرے پاس بیٹھ گئے اور کہا۔

"غالباً ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے۔ تحصیل صوابی (ضلع مردان) کے ایک گاؤں، نوا نکلی، میں ایک کاشتکار نوجوان لڑکا ایک دن اپنے گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی والدہ، ہمشیرگان، بیوی، سب کو بلا بھیجا۔ وہ حیرت سے چارپائی کے گرد کھڑی ہو گئیں تو اس نوجوان نے ان سے کہا کہ "تم جی بھر کر رو لو کہ میں

---

[1] سرحد کے اس پار، پٹھانوں کو "راشنے" کہتے ہیں۔

[2] میں نے قصداً شلوار کو مذکر لکھا ہے اس لئے کہ پٹھان کی شلوار اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اسے مؤنث لکھنا اس کی تحقیر ہے۔

تمہارے لئے آج سے مرچکا" یہ تحریک خلافت کا زمانہ تھا۔ یہ نوجوان باہر نکلا اور اگرچہ تحریک میں محض ایک رضاکار کی حیثیت سے شامل ہوا لیکن اپنے حسن سیرت و کردار اور مخلصانہ عرقریزیوں اور گرمجوشیوں سے علاقہ بھر میں آگ لگادی۔ عوام میں سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ حاجی صاحب ترنگزئی کے بند پڑے ہوئے مدرسے پھر سے کھلواتے۔ گاؤں گاؤں میں پنچائتیں قائم کیں۔ غرضیکہ اپنے رہنماؤں کی قیادت اور رفقاء کی معاونت سے علاقہ بھر میں تحریک کو ایک نئی زندگی اور زندگی کو ایک نئی تفسیر عطا کردی۔ اس زمانہ میں سیاسی تحریکوں میں شرکت آگ سے کھیلنے کے مترادف تھی۔ چنانچہ اس تگ و تاز و سعی و عمل کی شدید مخالفتیں ہوئیں لیکن اس شعلہ جوالہ نے کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مساعی کو جاری رکھا۔ یہ سلسلہ سنہ ۱۹۲۹ء تک قائم رہا جب افغان جرگہ وجود میں آیا اور رضاکاروں کا نام "خدائی خدمتگار" رکھا گیا جو عوام میں سرخپوش کے نام سے متعارف ہوئے۔ اس زمانہ میں خدائی خدمتگاروں کے مقاصد نہایت درخشندہ تھے۔ چنانچہ نوانکلی کے اس نوجوان نے اب سرخپوشوں کی تنظیم کا بیڑہ اٹھایا اور چند دنوں میں اسے ایک منظم جیش کی شکل دے دی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی سول نافرمانی شروع ہوئی تو حکومت نے سرخپوشوں کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا۔ یہ نوجوان گرفتار ہوا اور چھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا بھگتنے کے لئے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اس دوران میں حکومت نے سرخپوشوں پر سخت تشدد کیا جس سے یہ تحریک ماند سی پڑ گئی۔ چھ ماہ کے بعد یہ قید سے نکلا تو پھر وہی گرمجوشی پیدا ہو گئی۔ حکومت نے اس کا پھر تعاقب کیا تو یہ مفرور ہو گیا۔ لیکن فرار کی حالت میں بھی اپنا کام بدستور کرتا رہا حتیٰ کہ پھر گرفتار ہو گیا۔ اور جیل بھیج دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد گاندھی۔ ارون سمجھوتہ ہوا تو اسے بھی رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے پہ پھر وہی گرم جوشیاں شروع ہو گئیں۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں دوبارہ سول نافرمانی شروع ہوئی تو یہ صاحب روپوش ہو گئے اور حکومت اور پولیس کے علی الرغم روپوشی کی حالت میں برابر جماعت کی تنظیم کرتے رہے۔ حکومت نے تنگ آکر ان کے والد اور بھائی کو گرفتار کر لیا۔ جب اس پر بھی آتش انتقام سرد نہ ہوئی تو ان کی جائے سکونت کو نیلام کر دیا اور سامان زمینداری کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔ ان کا ایک قیمتی باغ کاٹ ڈالا اور مال مویشی سب ضبط کر لئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گرفتاری پر انعام مقرر کیا۔ ایک مخبر کی سازش سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اور دو سال قید بامشقت کی سزا پا کر پھر حوالۂ قید و بند ہو گئے۔ قید سے رہا ہوئے تو عام انتخابات کا زمانہ تھا۔ انہوں نے انتخابات میں اس برق رفتاری سے کام کیا کہ کانگریسی اراکین کی اکثریت سے ڈاکٹر خان کی وزارت قائم ہو گئی۔ اس فتح و کامرانی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو سرحد تشریف لائے۔ اب یہ نوجوان عبدالغفار خان کا دست راست اور صف اول کے رہنماؤں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کانگریس کے ایک ایسے ذمہ دار لیڈر سے ان صاحب کی بے تکلف گفتگو ہوئی۔ ان کی نگہ ژرف بین و دوررس نے فوراً بھانپ لیا کہ ہندو کے عزائم ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ حالات کیا تھے۔ صوبہ میں کانگریس کی وزارت تھی۔ پورے علاقہ میں سرخپوشوں کا راج تھا۔ عبدالغفار خان (فخر افغان) کی گویا پرستش ہوتی تھی۔ شہرت، عزت، مقبولیت، ثروت، سب ایک طرف تھیں۔ لیکن جب اس مخلص نوجوان نے محسوس کیا کہ سرخپوشوں کو کس طرح ہندو عزائم کے لئے آلۂ کار بنایا جا رہا ہے تو اس نے ایک ثانیہ کے تامل کے بغیر

عبد الغفار خان اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے، ملت حنیفیؑ کے موسس اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کے اتباع میں، اعلانیہ کہہ دیا کہ انا برآؤ منکم و مما تعبدون من دون اللہ .... ہم تم سے اور ان سب سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو قطع تعلق کا اعلان کرتے ہیں۔ کفرنا بکم و بدا بیننا و بینکم العداوۃ و البغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ۔ ہم تم سے بیزار ہیں۔ تم میں اور ہم میں کھلی ہوئی دشمنی اور عداوت رہے گی تاآنکہ تم ایک اللہ کی چوکھٹ پر نہ جھک جاؤ۔ اس اعلان نے سارے علاقہ میں ایک سنسنی پیدا کر دی۔ خان عبد الغفار خان باور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ وہ خود چل کر نوانکلی آیا اور دو دن تک ان سے مصروف افہام و تفہیم رہا۔ بحث و تمحیص، ترغیب و ترہیب، سب جتن کر دیکھے لیکن ایک بے لوث انسان کا ایمان ایسا کمزور نہیں ہوا کرتا کہ ان حربوں سے لغزش میں آ جائے۔ گفتگوئے مصالحت ٹوٹی تو ان لوگوں کی طرف سے اذیت رسانیوں کے مختلف حربے بروئے کار آنے شروع ہو گئے۔ لیکن جس مرد خود آگاہ کے عزائم کو انگریز کا تشدد کمزور نہ کر سکا تھا، اسے کانگریسی اقتدار کی معزت رسانیاں کیا سرنگوں کرتیں؟ ادھر سے تشدد تھا اور ادھر کانگریسی روباہ بازیوں اور ابلہ فریبیوں کے خلاف ہر جگہ کھلی کھلی تبلیغ۔ لیکن اس وقت تک ان کی یہ تمام مساعی تخریبی تھیں۔ یعنی کانگریس کی مخالفت۔ یہ اپنی جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے اور دوسری کوئی جماعت ایسی تھی نہیں جس میں شامل ہوا جائے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ملک میں مسلم لیگ کا چرچا ہو رہا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کو تو حکام پرستوں کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ سرحد میں انگریزی حکومت نے اپنے ہم نواؤں سے ایک اصلاحی جرگہ بنوایا تھا۔ جو عوام میں بے حد بدنام تھا۔ یہی جرگہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کا حامی کہا کرتا تھا۔ اس لئے سرحد کا کوئی مخلص سا رکن لیگ میں شمولیت کا نام تک نہ لیتا تھا۔"

میرا میزبان یہاں تک پہنچا تھا کہ ملازم پھر حقہ لے کر آ گیا۔ انہوں نے خشک تمباکو کا ایک کش لگایا اور کہنے لگے کہ یہاں تک بات پہنچی ہے تو بہتر ہے کہ تحریک مسلم لیگ کا پس منظر بھی سامنے آ جائے۔ (واضح رہے کہ میرا میزبان ایک خاموش سا مخلص مسلمان تھا جو نظری حیثیت سے سیاسیات سے بڑی گہری دلچسپی رکھا کرتا تھا۔ اس لئے اس اعتبار سے اس کا تجزیہ کوائف و حوادث بڑا صحیح ہوا کرتا تھا) انہوں نے کہا:

وہ آپ کو معلوم ہے کہ انگریز کی حکومت نے، ہر روباہ صفت حکومت کی طرح، ایک ایسے طبقہ کی تخلیق کی تھی جو رعایا اور حکومت کے درمیان حاجب و دربان کا کام دے۔ یہ صوبہ سرحد کی بات نہیں بلکہ سارے ملک میں ایسا کیا گیا تھا۔ قوم حاکم کے "رعب اور اقبال" کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ عوام کو حکام کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ لہذا یہ طبقہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، پبلک اور افسروں کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ یہ طبقہ، دیہاتی زندگی میں بڑے بڑے زمینداروں، نمبرداروں، ذیلداروں اور سفید پوشوں پر مشتمل ہوتا تھا اور شہری زندگی میں نوابوں، خان بہادروں، کرسی نشینوں، آنریری مجسٹریٹوں، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبروں کو محیط۔ سرحد میں اس طبقہ کو بالعموم خوانین کا گروہ کہا جاتا تھا۔ چونکہ یہ "سگان حضوری" تھے اس لئے عوام ان سے ڈرتے تھے۔ پبلک کی تمام مشکلات انہی کے توسط سے حل ہوتی تھیں۔ لہذا عوام کے دلوں میں ان کا "جبری احترام" رہتا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جس راستہ سے کوئی خان بہادر گزر جاتا، دکاندار دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔ کوئی معاملہ ان کی مرضی کے خلاف طے نہ ہونے پاتا۔ جس تقریب میں وہ شامل نہ ہوتے وہ اپنی تکمیل تک نہ پہنچ سکتی۔ حتیٰ کہ لڑکی اور لڑکوں

سکے سفیقہ تلسطے تک بھی ان کے استصواب کے بغیر قرار نہ پاتے۔ وہ عجیب زمانہ تھا۔ ان کی بڑی دھوم تھی۔

تحریک آزادی نے (جسے ہندوؤں کی زبان میں تحریک سوراج اور مسلمانوں کے الفاظ میں تحریک خلافت کہا جاتا تھا) عزت و احترام کے معیار بدل دیئے اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ وہی نواب اور کرسی نشین و دہی سردار اور رئیسان، جن کی گزرگاہوں پر لوگ دو رویہ تعظیم کے لئے کھڑے رہا کرتے تھے، منہ چھپا کر گھروں میں بیٹھ گئے اور ان کے دروازوں پر "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کے ماتم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اب ان کی کیفیت یہ تھی کہ اگر انہیں کسی اپنی غرض کے لئے بھی حکام کے پاس جانا ہوتا تھا تو راتوں کی تاریکیوں میں چوروں کی طرح چھپ چھپا کر نکلتے اور دبے پاؤں واپس آتے کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ کونسل اسمبلی تو بڑی چیز تھی، اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لئے بھی کھڑے ہونے کی جرأت نہ رہی۔ اگر کوئی کسی حاکم کی مدد کے بھروسے پر کہیں درخواست دے بیٹھا تو اس طرح ذلیل وخوار ہوا کہ کچھ گرہ سے دے کر جان چھڑانا پڑی۔ ان کے مقابلہ میں لوگوں نے بھنگیوں اور چماروں کو امیدوار بنا کر کھڑا کیا اور دھڑلے سے کامیاب بنا دیا۔ چنانچہ یہ دور پندرہ بیس برس تک جاری رہا اور یہ طبقہ اس طرح گمنامی کے گوشوں میں منہ چھپائے پڑا رہا۔ جس طرح سورج کی موجودگی میں چمگادڑیں روپوش ہو جاتی ہیں۔ آزادی کی تحریک میں یہ لوگ شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ اس تحریک میں جائدادوں کی ضبطی، ہتھکڑی اور اس کے بعد عدالتیں، جیل خانے، چکی کی مشقتیں، مار پیٹ سامنے نظر آتی تھی۔ لہٰذا عزت کے تمام دروازے ان پر بند تھے اور ذلت کی تمام راہیں کشادہ۔

اتنے میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور قلب ملت جناب قائداعظمؒ نے ملت کا مقدمہ، جو سرتاسر حق و انصاف پر مبنی تھا، اپنے ہاتھ میں لیا۔ ہنگامہ آرائیاں اور "تلاطم خیزیاں" ان کی فطرت سلیم کے خلاف تھیں۔ وہ تدبر اور ریاضت سے مخالفین کو قائل کرنے کے عادی اور داعی تھے۔ انہیں ضرورت صرف اتنی تھی کہ وہ جس عدالت میں اس عظیم مقدمہ کو لے کر جائیں، قوم کی طرف سے مختار نامہ ان کے ہاتھ میں ہو۔ ہندوؤں نے ان کے اس مطالبہ کی مخالفت کی اور ان کی ہمنوائی میں (بدبختی سے) مسلمانوں کے اس طبقہ نے بھی جو تحریک آزادی ہند کی گرمجوشیوں میں پیش پیش رہا تھا ایسا ہی کیا۔ لہٰذا اس میدان سیاست میں محترم قائداعظم کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ ان موقعہ پرستوں نے، جو کونوں اور کھدڑوں میں چھپے بیٹھے تھے، اس خالی میدان کو غنیمت سمجھا۔ انہیں محترم قائد کی سلامت روی اور امن پسندی سے یقین تھا کہ اس میدان میں "خطرہ" کی کوئی بات نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی چھنی ہوئی عزتوں اور کھوئی ہوئی عظمتوں کی بازیابی کے لئے باہر آ گئے اور "مسلم لیگ زندہ باد" کے نعروں سے قوم کے ترجمان بن گئے جیسا کہ کہا جا چکا ہے، محترم قائد کو اپنی لیاظ سیاست کی کامیابی کے لئے ضرورت ہی صرف اس قدر تھی کہ جب بھی کہیں ان سے پوچھا جائے، تو یہ کہہ دیں کہ ہاں! قوم کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور ہمارے مختار کار مسلم لیگ کے صدر محترم قائداعظم۔ یہ لوگ نہ پہلے سرکار کے طرفدار کسی عقیدہ اور یقین کی بنا پر ہوئے تھے نہ اب مسلم لیگ کے حامی کسی ملی نصب العین کے پیش نظر۔ وہ بھی موقعہ پرستی تھی اور یہ بھی موقعہ پرستی۔ قائداعظم کی فراست اور اخلاص نے اس جماعت (مسلم لیگ) کا وقار جو درحقیقت ان کی ذات سے منسوب تھا، آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا، اور یوں لکڑی کے ساتھ لوہا

تیرنے لگا۔ جیسا میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس تحریک میں خطرہ کی تو کوئی بات تھی ہی نہیں۔ تھوڑا سا صرفہ ضرور تھا سو اس عزت کے مقابلہ میں جو انہیں اس طرح حاصل ہو رہی تھی، یہ سودا "قطعاً" گراں نہیں تھا۔ اب وہی ٹوڈی بچے "جن کا ماتم" ہائے " سے ہوا کرتا تھا " زندہ باد " کے نعروں میں حیاتِ جاوید کے مستحق قرار پا رہے تھے!

یہ تو تھی ملک کی عمومی حالت، صوبہ سرحد میں یہ تفاوت اور بھی نمایاں تھا۔ یہاں سرخپوشوں کی تحریک کو دبانے کے لئے انگریز نے ان سرکار پرست نوابوں، سرداروں، "موجب خواروں" اور وظیفہ یابوں کو خاص طور پر استعمال کیا تھا۔ وہ جس قدر ظلم و تشدد چاہتا تھا، انہی کے ہاتھوں سے کراتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ صوبہ کے ایک ایک گھرانے میں ان سرکار پرستوں کے خلاف جذباتِ انتقام و غضب بھڑک رہے تھے۔ یہی وہ لوگ۔ تھے جن سے "اسلامی جرگہ" عبارت تھا اور بدقسمتی سے یہی وہ تھے جو شروع میں مسلم لیگ کے حامی بن گئے تھے۔ اب آپ خود ہی خیال فرما لیجئے کہ اس مسلم لیگ میں سرحد کا مسلمان کس طرح شریک ہو جاتا۔ کانگریسی مسلمان، لیگ کو انگریزوں کی "خود ساختہ" جماعت کہا کرتے تھے اور اس کے لئے انہیں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیگ کے حامی ان کے اس دعوے کی زندہ دلیل تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں نوانکلی کے اس "باغی سرخپوش" نے کانگریس کی مخالفت شروع کی تھی۔ اس کی فراستِ مومنانہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ مسلمان کے لئے لیگ کی حمایت ہی صحیح مسلک ہے۔ اب یہ مرحلہ پہلے مرحلہ سے بھی زیادہ حوصلہ طلب تھا۔ وہاں تو صرف کانگریسی رفقا اور سرخپوشی کی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جاتا تھا۔ یہاں اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ پیوست کرنا تھا جو اپنی سرکار پرستی میں گلی کوچے میں بدنام تھے۔ غور کیجئے۔ یہ مرحلہ کس قدر دشوار گزار اور ہمت طلب تھا۔ لیکن اخلاص کے سامنے کوئی مرحلہ بھی مشکل نہیں ہوا کرتا۔ قائداعظم نے اپیل کی کہ "مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگ رہی ہے اور میں خطرہ کی گھنٹی بجا رہا ہوں۔ کوئی ہے جو اس کام میں میرا ساتھ دے۔" نوانکلی کے مردِ مجاہد نے اس دردبھری اپیل کو سنا اور لبیک لبیک کہتا ہوا، ننگ و نام کی پرواہ کئے بغیر، مستانہ وار لیگ میں جا شامل ہوا۔ خود اور اس کے جاں نثار رفیقوں کی ساری جماعت۔ کانگریسی زعما اور سرخپوشوں کے اباطیل نے ایک شور مچا دیا کہ لیجئے! یہ بھی ٹوڈی ہو گئے۔ لیکن سرحد کے مسلمانوں کے سامنے اس مردِ قلندر کی ساری زندگی تھی وہ علی وجہ البصیرت جانتے تھے کہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص انگریز پرست ہو جائے۔ لہٰذا جس طرح ان حکام پرست لیگیوں کا وجود ہی لیگ کو سرکار پرست جماعت قرار دینے کی زندہ شہادت تھا، اسی طرح اس مردِ بے باک اور اس کے رفقاء کار کی لیگ میں شمولیت، لیگ کو سرکار پرستی کے ملعون لیبل سے بچانے کی دلیل قاطع اور برہان نیرہ تھی۔ انسان کا کیرکٹر دشمنوں سے بھی اس کا لوہا منوا دیتا ہے۔ پہلا بحران ختم ہونے کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ جب بھی کانگریسیوں کی طرف سے یہ طعن دیا جاتا کہ لیگ انگریز پرستوں کی جماعت ہے۔ اور جواب میں یہ کہہ دیا جاتا کہ کیا ارباب نوانکلی بھی انگریز پرست ہیں؟ تو ان کا منہ بند ہو جاتا۔

اب لیگ کچھ اور تھی۔ اب گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ لیگیں بنی شروع ہو گئیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں یہ مردِ مجاہد، تحصیل صوابی کی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ بس اس دن سے ان کا نام ہی "صدر صاحب" ہو گیا۔

صدر صاحب ایک غریب زمیندار تھے۔ اپنا اثاثہ پہلے لٹا چکے تھے۔ لیگ کی تنظیم کے لئے روپیہ کہاں سے آتا؟ پہلے اپنا مکان رہن رکھا۔ پھر زمین رہن رکھی (یہ چیزیں حکومت کانگریس کے زمانہ میں واگذار ہو گئی تھیں) یہ سال بھر دورے میں رہتے تھے۔ اس لئے کھیتی باڑی کی نگرانی کس طرح ممکن تھی؟ یہ سارا صوبہ ان کا مداح خواں اور پرستش کرتا تھا۔ ان کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لوگ ان خوانین اور سرداروں پر اعتراض کرتے تھے جو لیگ کے سربراہ بن رہے تھے۔ اس زہر کا اثر زائل کرنے کے لئے انہیں اشخاص اور اصولوں کے فرق کو ذہن نشین کرانا پڑتا تھا جو ایک مشکل کام تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے اخلاص و کردار سے علاقہ بھر کو لیگ کا گرویدہ بنا دیا۔ اس جہاں گردی سے کھیتی باڑی کا سب دھندا برباد ہو گیا۔ اور گھر والوں کے اخراجات بھی قرض سے چلنے لگے۔ اپنے علاقے میں تو پھر بھی مکئی کی روٹیاں چادر میں باندھ کر پاپیادہ سفر ہو جاتا تھا۔ لیکن مشکل اس وقت آتی تھی جب لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے باہر جانا پڑتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لیگ کے ہر اجلاس میں شرکت کے لئے انہیں ایک ایک کھیت رہن رکھنا پڑتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں صوبہ کے انتخابات ہوئے اور صدر صاحب صوبہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔

جب مسلم لیگ کو اس طرح مقبولیت حاصل ہو گئی تو قوت و جاہ طلب افراد کے دلوں میں وزارت کا شوق انگڑائیاں لینے لگا۔ "صدر صاحب" نے انہیں اس ارادہ سے روکا۔ ان کا یہ فیصلہ نہایت تدبر و فراست اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت لیگ کا جو بھرم بنا ہوا ہے وہ ان ارباب ہوس کی اقتدار پرستیوں سے خاک میں مل جائے گا۔ لیکن ان کی کسی نے نہ مانی اور خوانین۔ اورنگ زیب خاں نے لیگ وزارت مرتب کر لی۔"

اب ملازم قہوہ لے کر آ گیا اور میرے میزبان نے ایک فنجان مجھے تیار کر کے دیا اور ایک فنجان خود اٹھایا۔ "صدر صاحب" کے متعلق داستان اس قدر دلچسپ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ قہوہ کا فنجان جلدی سے ختم ہو جائے۔ لیکن پٹھان ایسا گرم قہوہ پیتے ہیں کہ اسے سانس کے زور سے کھینچ کر پیا (بلکہ یوں کہیئے کہ چکھا) جاتا ہے۔ پیالی ختم ہوئی تو میرے میزبان نے سلسلۂ کلام کو پھر جاری کیا اور فرمایا۔

• اب سنو کہ کیا ہوا۔ یہی صدر صاحب جن کی مساعی کے صدقے ان خوانین کو یہ مسند حکومت و اقتدار نصیب ہوئی تھی، ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگ گئے۔ اس لئے کہ وہ ہر ناروا حرکت پر روکتے تھے اور بہ حیثیت صدر مسلم لیگ ان کی تمام کارروائیوں کا کڑا جائزہ لیتے تھے۔ لہٰذا سوچا گیا کہ اس کانٹے ہی کو پہلو سے نکال دینا چاہیئے۔ چنانچہ آئین و قوانین کی تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اورنگ زیب خاں صاحب و رفقاء نے میاں کے ایک صاحب کو صوبہ لیگ کا صدر بنا دیا اور صدر صاحب کو صدارت سے الگ کر دیا۔ اس فیصلہ سے سارے علاقہ میں آگ سی لگ گئی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس آگ کو بجھانے والا کون ہے؟ خود "صدر صاحب"! یہ جگہ جگہ پھر رہے ہیں اور لوگوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ خدا کے لئے لیگ کو نقصان نہ پہنچانا۔ آج کے جلسہ میں آپ گئے تھے۔ وہ بھی اسی غرض کے لئے منعقد ہوا تھا۔ لوگ تلے بیٹھے تھے کہ لیگ کو درہم برہم کر دیا جائے۔ وہ "صدر صاحب" اور لیگ کو دو الگ الگ چیزیں تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ان کا یہی فیصلہ تھا لیکن اس فیصلہ کو الٹ دینے والے یہی صدر صاحب تھے۔ یہ تماشا تو آپ نے

اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔"

اس وقت نصف شب سے قریب گزر چکی تھی۔ میرا میزبان مجھے شب بخیر کہہ کر چلا گیا اور میرے لئے تصورات کی ایک دنیا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں حیران تھا کہ بارالہا! ہم میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا یہ عالم ہے۔ میں اس سے پیشتر یہ باور کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا کہ ہمارے سب سے سوتے یا دلوں میں ہنوز ایسی ایسی تجلیاں پوشیدہ ہیں۔ علی الصبح میں بغیر کسی کو اطلاع دیئے اُدھر نکل گیا تاکہ اس مردِ مومن کے ہاتھوں کو بوسہ دے سکوں۔ لیکن وہ گذشتہ شب کسی اور طرف "دورہ" پہ نکل گئے تھے۔ وہاں بہرحال، میں ان کے رفقائے کار سے ملا اور ان سے بھی بہت کچھ سنا۔ صدقِ مقال اور اکل حلال کی جن داستانوں کو ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے اس کا آنکھوں دیکھا حال تو انہی کے ان لوگوں کی زبانی سنا۔

اب صوبہ کی حکومت نے، ہر مستبد حکومت کی طرح، صدر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ الزام تراشی، تہمت طرازی، پولیس کی نگرانی وقس علیٰ ذلک۔ ہر وہ حربہ جو حق گوئی اور بیباکی کے جرم میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے، استعمال کیا گیا۔ وہ اس قسم کی اذیت رسانیوں میں مصروف تھے اور صدر صاحب اس کوشش میں سرگرم مارے مارے پھر رہے تھے کہ عوام لیگ کے خلاف نہ ہو جائیں۔ لیکن اب یہ ناسور، صدر صاحب کی کوششوں سے اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس ناز کو انسان کی دعائیں بچا نہیں سکتی تھیں۔ لیگی حکومت کی بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں اس درجہ بڑھ چکی تھیں کہ وہ پٹھان جنہیں انگریز کے تصور سے نفرت تھی، دعائیں مانگتے تھے کہ اس حکومت کے بدلے دفعہ ۹۳ کے ماتحت گورنری راج ہی آ جائے۔ یہی تھے وہ اسباب جن کی بنا پر صدر صاحب صوبہ میں لیگی وزارت کے قیام کے خلاف تھے۔ لیکن اس معاملہ میں بھی خود صدر صاحب سب سے بڑھ کر مشکل میں تھے۔ کانگریسی مسلمان جگہ جگہ انہیں طعن دیا کرتے تھے کہ کیوں! یہی ہے وہ آزاد حکومت جس کے لئے تم ہم سب سے الگ ہوئے تھے۔ مسلم لیگی عوام جو محض صدر صاحب کی کوششوں سے لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ حکومت کی بدعنوانی کے لئے صاحب صدر کو ہی مورد الزام ٹھہراتے تھے کہ

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اور حکومت کا ان کے ساتھ جو سلوک تھا اسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لیگ کے مقصد سے ان کا عشق تھا کہ انہیں لئے لئے پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ لیگ وزارت سخت بدنام ہو گئی اور اس کے بعد خود اپنے بوجھ ہی سے ٹوٹ گئی۔ صدر صاحب نے قیام وزارت سے پہلے ہی اس کے انجام کے متعلق جو کچھ کہہ رکھا تھا، وہی کچھ ہو کر رہا۔ اب پھر ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت برسراقتدار تھی اور لیگ کے لئے حالات سخت ناساعد اور صدر صاحب کے لئے فضا بے حد ناسازگار۔ لیکن وہ اس پر بھی برابر مصروف سعی و عمل رہے کہ ناسازگار ماحول سے متاثر ہو کر مایوس ہو جانا ان کی فطرت ہی میں نہیں۔

۱۹۴۶ء میں بمبئی میں فسادات ہوئے تو سرحد سے ایک تحقیقاتی کمیٹی، صدر صاحب کی صدارت میں تفتیش حالات کے لئے بمبئی گئی۔ وہاں سے واپسی پر صدر صاحب کو دہلی میں معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی سرحد جا رہے ہیں۔ صدر صاحب کی نگاہ اس موقعہ کی اہمیت کو بھانپ گئی۔ انہوں نے وہیں سے پراونشل مسلم لیگ سرحد کے سیکرٹری کو تار دیا کہ صوبہ لیگ کا ایک اجلاس خصوصی فوراً طلب کیا جائے۔ صدر صاحب خود پنڈت جواہر لال کے سرحد پہنچنے سے تین دن قبل پشاور پہنچ گئے اور لیگ کے اجلاس میں اس مسئلہ کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا کہ اراکین کو اپنے ساتھ ہم نوا کر لیا۔ اب اس تین دن میں صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے وہاں کیا کچھ کیا، اس کا جواب اس سے لیجئے کہ جواہر لال صاحب کے ساتھ سرحد میں کیا کچھ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بہت سے دیگر دردمند اور صاحب ہمت حضرات کی کوششیں بھی شامل تھیں لیکن صدر صاحب اور ان کے رفقاء کا اس میں نمایاں حصہ تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلہ پر حملہ کرنے کے الزام میں صدر صاحب پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔

اسی دوران میں حلقہ مردان میں ایک ضمنی انتخاب سامنے آیا جس کے متعلق ڈاکٹر خان صاحب نے دہلی سے چیلنج دیا تھا کہ کانگریس اور لیگ کی فتح و شکست کا مدار اسی انتخاب پر ہے۔ یہ صدر صاحب کا اپنا علاقہ تھا۔ اس میں انہوں نے اس تن دہی اور جانفروشی سے کام کیا کہ اللہ کی نصرت نے ان کی مساعی کو کامرانی سے نوازا۔ اور انتخاب لیگ کے حق میں ہوا۔ اب صدر صاحب نے بھانپ لیا تھا کہ صوبہ میں کانگریس کا زور توڑنے کے لئے حکومت سے تصادم ضروری ہے۔ لہذا انہوں نے مردان سے سول نافرمانی کی ابتدا کر دی اور پھر پشاور پہنچ کر اسے وسیع پیمانے پر پھیلانے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ اتنا کر لے پائے تھے کہ حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جیل خانہ بھجوا دیا۔ اس موقعہ پر قدرت نے حضرت پیر صاحب مانکی شریف (اعلی اللہ معارجہ) کو اس طرف متوجہ فرما دیا۔ اور انہوں نے اس ہمت، جرأت اور بیباکی سے اس تحریک کو کامیاب بنایا کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی (حضرت پیر صاحب کے مجاہدانہ تگ و تاز اور اس کا "صلہ" ایک الگ داستان ہے اور فرصت کی محتاج) صدر صاحب کو جیل گئے قریب چھ ماہ ہوئے تھے کہ سرحد میں ریفرنڈم کا چرچا ہوا۔ اب جو ان کی رہائی ہوئی ہے تو انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ حق اور باطل کا آخری معرکہ ہے۔ اس معرکہ میں حق کی کامیابی کے لئے صدر صاحب نے صوبہ بھر میں بگولے کا سا رقص کیا اور وہاں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ ادھر پیر صاحب مانکی شریف کے مجاہدانہ سعی و عمل نے فضا کا رنگ بدل دیا۔ اللہ نے ان مخلص کارکنوں کی کوششوں کو اپنی توفیق و تائید سے نوازا اور سرحد میں ہندو کی سازشیں ختم ہو گئیں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس کے بعد پھر لیگ وزارت قائم ہو گئی اور پھر وہی خود غرضانہ دسیسہ کاریاں شروع ہو گئیں۔ حضرت پیر صاحب کے ساتھ وہاں کیا کیا گیا، یہ حدیث کچھ کم جگر خراش نہیں۔ لیکن اس سے کہیں الم انگیز یہ داستان ہے کہ صوبہ سے اس تشتت و انتشار کو ختم کرنے کے سلسلہ میں صدر صاحب نے جو جد و جہد کی اسے متعلقہ حلقوں میں غلط معنی پہنائے گئے۔ بے غرض انسان کے ساتھ یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ یہ خلفشار بڑھ رہا تھا کہ اتنے میں جہاد کشمیر شروع ہو گیا اور یہ اللہ کا بندہ سیدھا میدان جنگ میں جا پہنچا۔

پچھلے دنوں سرحد میں مسلم لیگ کے انتخاب جدید ہوئے اور جس طرح سے یہ انتخاب عمل میں آئے اگر اس کی تفاصیل بیان کی جائیں تو ہر قلب حساس کی نگاہیں شرم سے زمین میں گڑ جائیں۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ انتخاب تو ایک حرف رکنیت کے فارم تک بھی ایک خاص حلقہ سے باہر نہیں جانے دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں حضرت پیر صاحب مانکی شریف کو جس طرح کراچی کے چکر لگانے پڑے وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فارم صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار (یا حضرت پیر صاحب اور ان کی جماعت) کو کبھی نہیں مل سکتے تھے۔ ان جیسے "باغیوں" کا بھلا لیگ میں کیا کام؟

اب صورت یہ ہے کہ ٹوانکلی کا یہ مرد مجاہد جس کی تمام عمر مسلمانوں کو سربلند دیکھنے اور اپنے صوبہ میں پاکستان کا علم بلند کرنے میں صرف ہو گئی اور جس نے اس مقصد عزیز کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا، اب پاکستان کی "اسلامی حکومت" میں اپنے گاؤں کے ایک حجرے میں معتوب و مغضوب پڑا ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس "کانٹے" کو پہلو سے نکالنے کے لئے ارباب ہوس واقتدار کس کس قسم کے نشتر استعمال کریں۔ جرم اس کا صرف یہی ہے کہ قالوا ربنا اللہ۔ یہ کہتا ہے کہ جھکنا صرف خدا کے حضور جائز ہے اور سب اس کے بندے اور مخلوق خدا کے خادم ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جن مقاصد کا اعلان کر کے قوم کو دعوئے پاکستان کا ہمنوا بنایا تھا ان وعدوں کو پورا کرو۔ خدا کے بندوں کو خدا کی محکومی میں رکھو۔ پاکستان کو غریبوں کی امیدوں کا ماویٰ و ملجا بننے دو۔ اسے اپنی کامرانیوں کا جہنم نہ بناؤ۔ آج ایسا کہنے والے کی سزا اس سے بھی سخت ہونی چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر صدر صاحب آج بھی چاہیں تو صوبہ میں لیگ کے مقابل ایک فعال جماعت قائم کر سکتے ہیں لیکن ملت میں تفرقہ کسی قیمت پر بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ خود مٹ جائیں گے لیکن قوم میں تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیں گے۔

بہرحال یہ ہیں مختصر سے کوائف زندگی معماران پاکستان میں سے اس ایک کے جس کی ہڈیوں کے چونے اور لہو کی سرخی سے یہ قصر جمیل تیار ہوا ہے اور جو اب ارباب ہوس کا عشرتکدہ بن رہا ہے۔

اگر آپ اس مرد مجاہد سے ملنا چاہیں تو ضلع مردان کے گاؤں ٹوانکلی میں ملئے۔ وہاں بخت جمال خان کہہ کر نہ پوچھئے کہ گاؤں کے نوعمر لڑکے اس نام سے آشنا نہ ہوں گے۔ "صدر صاحب" کہہ کر دریافت کیجئے تو پانچ سال کا بچہ بھی آپ کو سیدھا اس کھیت کی طرف لے جائے گا جہاں پاکستان کا یہ لعل جلیل کہ جس کا مقام آج سب سے بلند ہونا چاہیئے تھا، گھاس کھود رہا ہوگا۔

اضافہ

(دیباچہ)

اب نہ جلیے چراغ رخ زیبا لیکر

یہ ۱۹۴۹ء تک کی داستان ہے مجھے اس میں اس مقام پہ ایک کڑی کا اضافہ کرنا ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ

یہ مردِ مجاہد کس طرح کانگریس (سرخپوشوں کی جماعت) سے کٹ کر مسلم لیگ کیطرف آیا۔

طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ مقصد اس کا مطالبۂ پاکستان کی تائید و حمایت تھا کہ یہ مطالبہ اسکے نزدیک دین کا تقاضا تھا۔ اگرچہ اس کے مدمقابل نیشنلسٹ مسلمانوں کی تمام جماعتیں تھیں، لیکن اس کا خصوصی محاذ، قومیت پرست "علماء" کا گروہ تھا جو مذہب کے نام پر عوام کو اس تحریک سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنا بریں، طلوعِ اسلام میں جو کچھ شائع ہوتا وہ کتاب و سنت کی تعلیم پر مبنی ہوتا تھا۔ میں اگرچہ اس زمانے میں سرکاری ملازمت میں منسلک تھا لیکن اسکا ہر ایک کو علم تھا کہ اس قرآنی فکر کا سرچشمہ کہاں ہے میری قیام گاہ ان سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک شام وہی بزرگ (جو بعد میں "صدر صاحب" کے لقب سے پکارے گئے) میرے ہاں تشریف لائے۔ بڑے غصے میں بھرے ہوئے مجھے نظر آتا تھا کہ وہ جنگ کے لئے بالکل تیار ہیں۔ لیکن میں نے حسبِ معمول، لینت اختیار کی۔ چند ہی ثانیوں کے بعد میں نے محسوس کر لیا کہ ان کا وہ تمام غصہ اور جوش و خروش خلوص پر مبنی ہے۔ وہ دیانتداری سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں (بلکہ اسلام) کے لئے مفید ہے۔ میں نے انہیں کتاب و سنت کی روشنی میں مطالبۂ پاکستان کی کیفیت، ماہیت، علت، اور غایت سمجھانے کی کوشش کی۔ دوسری یا تیسری نشست میں انہوں نے اسی جوش اور ولولے کے ساتھ کہہ دیا کہ میں سمجھ گیا مسلمانوں کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کا قیام جس میں قرآنی نظام رائج ہو، دین کا تقاضا ہے۔ اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش اسلامی جہاد۔ یہ کہہ کر وہ میرے ہاں سے اٹھے اور سیدھے سرحد چلے گئے اور وہاں جا کر سرخپوشوں سے علیحدگی کا وہ اعلان کر دیا جس کا ذکر آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ میرے ساتھ ان کا یہ قلبی رشتہ اس زمانے میں استوار ہوا۔ دن بدن بڑھتا گیا اور آخری وقت تک قائم رہا۔ میرے ہاں ان کی کیفیت بالکل گھر کے بزرگ کی سی تھی۔ یہاں کے بچے ان کی گود کے پروردہ تھے۔ لہٰذا وہ جب بھی تشریف لاتے، مجھے نہ کسی قسم کا تردد کرنا پڑتا، نہ کوئی خاص اہتمام۔ (ویسے بھی ان کی زندگی ایسی سادہ تھی کہ ان کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی)۔ وہ بچوں میں بالکل بچے بن جاتے تھے۔ انہیں ان سے بڑا پیار اور انہیں ان سے بڑی محبت تھی۔

میری قرآنی فکر سے انہیں والہانہ دلبستگی تھی۔ وہ اس کے سفیر رواں تھے۔ انہوں نے اس شمعِ قرآنی کی روشنی سرحد کی تیرہ و تاریک چپاؤں تک پہنچا دی۔ صوبہ سرحد اپنی متشدد قدامت پرستی کے لئے مشہور ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں ان کی کس قدر مخالفت ہوتی ہوگی۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ وہ طلوعِ اسلام کی ہر کونشن میں نہایت جذب و شوق اور جوش و ولولہ کے ساتھ شریک ہوتے۔ اور انکی ایمانی حرارت اس تحریک کے ہر دو گرد اہل میں بڑی حدت اور گرمجوشی پیدا کر دیتی۔ ان کا وجود فی الحقیقت روشنی کا مینار تھا۔ اور ان کے معصومانہ قہقہے بانگِ درا۔

لیکن ادھر سے ہٹ کر آپ پھر وہیں پہنچے جہاں "حق شناس" نے ۱۹۴۹ء تک ہمیں پہنچایا تھا۔ سرحد کی مسلم لیگی حکومت کو ان کا اپنے گاؤں میں گھاس کھودنا بھی خوش نہ آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ان کی حق گوئی اور بیباکی، اور دوسری طرف عوام میں ان کی بے پناہ مقبولیت سے ہر وقت خائف رہتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کو جلا وطن ہونا

چلا۔ وہ کراچی آ گئے اور وہاں نہایت خاموشی سے تمباکو فروشی کا کچھ دھندا شروع کیا۔ لیکن کہاں صدر تحریک جمال خان اور کہاں تمباکو فروشی! اس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ان پر کیا گذرتی رہی ہیں ان جگر سوز تفاصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ بس اتنے پر ہی اکتفا کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی زندگی کے آخری سال گمنامی ہی میں نہیں بلکہ اس قدر صعوبات، تفکرات اور پریشانیوں میں گزرے کہ ان کے تصور سے دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آتا ہے۔ لیکن اس مردِ غیور نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ تحریک کے زمانے کے رفقاء میں سے اکثر اقتدار کی کرسیوں پر متمکن تھے۔ انہوں نے کسی کے دروازے پر دستک نہ دی۔ مجھے انتہائی رنج ہی نہیں بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ ان حضرات کو ان کی پریشانیوں کا علم اور ان پر جس قدر زیادتیاں ہوئیں، ان کی خبر تھی۔ لیکن ان میں سے کسی نے ان کی مدد کرنا تو ایک طرف، اظہارِ ہمدردی تک بھی نہ کیا۔ وہ سابقہ کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں تشریف لائے تو ان کی صحت بہت گر چکی تھی۔ بایں ہمہ، ان کے جوش و ولولہ اور سرگرمیٔ عمل میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تھی، لیکن میں نے محسوس کر لیا کہ اب یہ دیوار گرا ہی چاہتی ہے۔ چنانچہ ۲۴ فروری کی شب مجھے نو بجے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ صدر صاحب نہایت خاموشی سے اس دنیا کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے ان کی آواز کبھی بھی سنائی نہیں دے گی۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ ؎

— دہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا ......

مجھے کوئی ایسا ذریعۂ سفر میسر نہ آسکا کہ ان کے جنازہ میں شرکت کر سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے جنازہ میں کون کون شریک ہوا۔ قیاس یہی ہے کہ یہ گاؤں کے لوگوں تک ہی محدود رہا ہوگا۔ اتنا ہی نہیں، میں نے کسی اخبار میں ان کی وفات کی خبر تک نہیں دیکھی۔ (سرحد کے کسی مقامی اخبار میں کوئی خبر شائع ہوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا)۔ اُف! کس قدر احسان فراموش ہے ہماری قوم! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اگر یہ شیرِ غاب مسلک قومیت پرستی کو چھوڑ کر تحریکِ پاکستان کا موید نہ بنتا تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔ لیکن اتنا تو بلا خوفِ تردید اور اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس صورت میں کم از کم صوبہ سرحد پاکستان کا حصہ نہ بن سکتا۔ اور اس کے جو نتائج ہوتے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تھا مقام اس محسنِ ملت کا، جسے اس کی قوم نے جیتے جی اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔ اور جس کی موت پر اس کی آنکھ سے ایک قطرۂ اشک تک نہ ٹپکا!

اے پیکرِ صدق و صفا۔ اے مجسمۂ خلوص و محبت۔ اے محسنِ ملت۔ اے معمارِ پاکستان۔ اے فدائی اسلام۔ اے پروانۂ شمعِ قرآن۔ خدا آپ کو اپنے سحابِ کرم کے سایۂ عاطفت میں رکھے۔ طوبیٰ لکم وحسن مآب۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

دل فگار

پرویز

لاہوری "احمدیوں" سے صرف دو سوال پوچھیے

ستمبر ۱۹۷۴ء کے فیصلہ کے بعد اہلِ ربوہ تو (بظاہر) خاموش ہیں لیکن لاہوری "احمدی" بہت تلملا رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اہلِ ربوہ جو کچھ مانتے تھے اس کا کھلے بندوں اعلان کرتے تھے۔ اور لاہوری حضرات نقاب پوش رہتے تھے۔ اب جو ان کی نقاب الٹی ہے تو وہ اپنے چہرے کو چھپانے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم نہ تو مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور نہ ہی "غیر احمدیوں" کو کافر کہتے ہیں۔ ہم تو انہیں مسیح موعود یا مجدد مانتے ہیں۔ اور بس۔ ہمارے عوام (چھوڑ خواص) کو بھی حقیقت کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ ان کی مغالطہ آفرینی کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ ان سے بحث میں نہ الجھئے صرف دو سوال پوچھیے:

پہلا سوال۔ ان سے کہئے کہ آپ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا دعویٰ صرف مسیح موعود ہونے کا تھا اور یہ دعویٰ ایسا نہیں جس کے نہ ماننے سے کفر لازم آجاتا ہو۔ لیکن مرزا صاحب نے اس باب میں یہ کہا ہے۔

> کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ ہے کہ ایک شخص اسلام ہی سے انکار کرتا ہے اور آنحضرت ؐ کو رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا۔ اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔
>
> (حقیقۃ الوحی۔ ص ۱۷۹)

ان سے پوچھئے کہ جو لوگ مرزا صاحب کو مسیح موعود نہیں مانتے وہ مرزا صاحب کے قول کے مطابق، کافر قرار پاتے ہیں یا نہیں؟

دوسرا سوال۔ ان سے یہ پوچھئے کہ جہاد بالسیف (یعنی تلوار سے مخالفین کے خلاف جنگ کرنا) قرآن مجید کا حکم ہے اور مرزا صاحب نے کہا تھا کہ۔

> آج سے انسانی جہاد (جو تلوار سے کیا جاتا تھا) خدا کے حکم سے بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے، وہ اس رسول کریم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرمایا کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔
>
> (اربعین ۴۔ ص ۱۵)

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ — دین کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال۔

ان سے پوچھئے کہ جو شخص قرآن کریم کے ایسے اہم حکم کو منسوخ اور حرام قرار دینے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ مسلمان کہلا سکتا ہے؟ اگر وہ کسی لفظی الٹ پھیر سے کام لیں، تو ان سے کہئے کہ اس باب میں خود مرزا صاحب نے فیصلہ دے رکھا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

> ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہو سکتا نہ کم ہو سکتا ہے۔ اور اب کوئی ایسی وحی یا الہام منجانب اللہ نہیں ہو سکتا جو احکام فرقانی کی ترمیم و تنسیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیلی یا تغیر کر سکتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعت مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے۔

(ازالہ اوہام۔ ص ۱۳۸۔ بحوالہ پیغام صلح بابت ۵ مارچ ۱۹۲۳ء)

ان سے پوچھئے کہ مرزا صاحب کے اپنے فیصلہ کے مطابق، وہ "جماعت مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر" قرار پاتے ہیں یا نہیں۔ اور جو اس کے باوجود، انہیں (مرزا صاحب) کو مسلمان سمجھے وہ بھی ویسا ہی قرار پاتا ہے یا نہیں؟

ان سے ان دو سوالات کے دوٹوک جواب مانگئے۔ اور ادھر ادھر بالکل نہ ہونے دیجئے۔ جہاں تک ہو سکے۔ آپ ان سوالات کی عام اشاعت کیجئے۔ اسی سے اس فتنہ کا سدباب ہو سکے گا۔ جسے یہ حضرات اپنی روایتی مغالطہ آفرینی سے پھیلا رہے ہیں۔

اگلے شمارہ میں

(۱) فرقہ اہل قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں۔

مبسوط مقالہ اور سیر حاصل تجزیہ

(۲) اقبال اور ختم نبوت

(یوم اقبال کی تقریب پر خصوصی خطاب)

کراچی میں

ادارہ طلوع اسلام کی

مطبوعات

حاصل کرنے کے لئے

دفتر بزم طلوع اسلام کراچی

سے رابطہ قائم کریں

پتہ

دار القائد۔ ۲۰-اے/بی۔ ناظم آباد نمبر ۳۔

(بس سٹاپ۔ کراچی۔ فون ۶۱۰۴۶۸

وفاقی حکومت پاکستان وضاحت کرے

(ربوہ کے روزنامہ الفضل کی اشاعت بابت ۲۰ مارچ ۱۹۷۵ء کے صفحہ اول پر جلی حروف میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے)

شناختی کارڈ حاصل کرنے کا جو فارم پُر کرنا پڑتا ہے اس میں ایک خانہ "مذہب" کا ہے۔ اسی طرح سکولوں میں داخلہ کیلئے فارموں میں بھی "مذہب" کا خانہ ہے۔ بعض اور فارموں میں بھی ہوگا۔ متعلقہ افسران اصرار کرتے ہیں کہ احمدی اپنے آپ کو غیر مسلم درج کریں۔ ان کا یہ مطالبہ غیر آئینی اور بالکل غیر منصفانہ ہے۔

یہ درست ہے کہ صرف دستور پاکستان اور قانونی اغراض کے لئے "احمدی" مسلمان قرار نہیں دیئے گئے۔ لیکن ساتھ ہی دستور کا آرٹیکل ۲۰ ہر شخص کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ جو مذہب بھی رکھتا ہو اس کا برملا اظہار کرے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ یہ حق بدستور قائم ہے۔ اس حق کو وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کی اس تقریر میں جو انہوں نے احمدیوں کے متعلق دستور میں ترمیم کے وقت کی اور زیادہ وضاحت اور خوبصورتی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "ہر پاکستانی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ فخر و اعتماد سے بغیر کسی خوف کے اپنے مذہبی عقاید کا اظہار کر سکے۔ پاکستان کے آئین میں پاکستانی شہریوں کو اس امر کی ضمانت دی گئی ہے"۔

ہم اپنے مذہب کے متعلق اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر جس کی جھوٹی قسم کھانا انسان کو اس کے غضب کے نیچے لے آتا ہے یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، یوم آخرت پر، حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کے خاتم النبیین ہونے پر اور قرآن کریم کے آخری شریعت ہونے پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے سب احکام کو اپنے لئے فرض جانتے ہیں اور ان پر عمل کرنے میں ہی اپنی نجات یقین کرتے ہیں کلمہ طیبہ

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ہی ہمارا کلمہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ کے تحت ہی ہم حضرت مرزا غلام احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مسیح موعود اور مہدی معہود یقین کرتے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں۔ یہی ہمارا مذہب ہے، اس کے علاوہ اور کوئی مذہب نہیں۔

پس ہم اس آزادی مذہب کی ضمانت کے ہوتے ہوئے جو ہمیں دستور پاکستان میں دی گئی ہے اپنے آپ کو کس طرح راستی اور دیانتداری کیساتھ غیر مسلم لکھ سکتے ہیں؟ جبکہ ہم اپنے دلوں کی گہرائیوں سے بھی اسلام اور صرف اسلام کو مانتے ہیں اور باقی سب مذاہب کو اس کے مقابل میں جھوٹا سمجھتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو غیر مسلم کیسے کہہ یا لکھیں۔ ہم خود کو "احمدی" لکھ سکتے ہیں لیکن "غیر مسلم" نہیں لکھ سکتے۔ اس بات کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ دستور یا قانون کی اغراض کے لئے ہمیں مسلمان نہیں سمجھا گیا خود ہمیں قانوناً مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے آپ کو غیر مسلم لکھیں۔ یہ جھوٹ ہوگا اور یہ عقلاً، قانوناً اور اخلاقاً بھی درست نہیں اور راست گوئی کے بھی خلاف ہوگا اور یہ امر ہر لحاظ سے واضح اور صریح ہے۔ ہم "احمدی مسلمان" ہی کہلا سکتے ہیں۔ دیگر مواقع پر بھی یہی صورت ہو سکتی ہے"۔

طلوع اسلام — اس وقت نہ گنجائش ہے نہ ضرورت کہ ہم اس بیان پر کوئی تبصرہ کر سکیں۔ لیکن ہم وفاقی حکومت پاکستان سے گزارش کریں گے کہ وہ اس کی بہت جلد وضاحت کرے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے۔

دو اہم کتابوں کے نئے ایڈیشن

(۱) شعلۂ مستور

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، کوائف حیات اور دنیا سے تشریف براری کی اصل وحقیقت ایک معمہ بنے چلی آ رہی ہے جسے سمجھنے کے لئے ہر قلب متجسس بیتاب ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی قرآنی بصیرت اور وسیع مطالعے کے بعد اپنی کتاب شعلۂ مستور میں ان موضوعات پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ لیکن وہ کتاب ایک عرصے نایاب تھی۔ اب انہوں نے، مزید تحقیقات کی روشنی میں اس پر نظر ثانی کی ہے اور اس کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور مضبوط جلد اور دیدہ زیب گرد پوش سے مزین ہے۔ اشیائے طباعت کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے اس پر بڑی لاگت آئی ہے لیکن ہم نے اس میں خساست سے کام نہیں لیا۔

قیمت۔ فی جلد۔ پچیس ۲۵ روپے۔ محصولڈاک۔ دو روپے۔

نوٹ:- شعلۂ مستور جن کھاتہ داروں کو نہ درکار ہو وہ ادارہ کو ۱۵ اپریل تک مطلع فرما دیں۔

---

(۲) ختم نبوت اور تحریک "احمدیت"

یہ وہ کتاب ہے جس کا ملک میں عام چرچا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو اکتوبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس دوران میں قارئین کی طرف سے مزید اضافہ کی تجاویز موصول ہوئیں۔ چنانچہ اب اس کا نیا ایڈیشن ان اضافوں کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اسے بھی عمدہ سفید کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور طباعت بھی پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں، صاف اور نکھری ہے۔ نیز اسے اب مجلد شائع کیا گیا۔ ان خصوصیات کی بنا پر اس کی قیمت میں تھوڑا سا اضافہ ناگزیر تھا۔ چنانچہ اب اس کی قیمت پندرہ روپے فی جلد ہے اور محصولڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔ فرمائشیں اس کے لئے بھی بہت سی موصول ہو چکی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ بھی اپنی فرمائش جلد بھیج دیں تاکہ اگلے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ ختم نبوت کی اہمیت اور حقیقت کے سمجھنے اور تحریک "احمدیت" کے محرکات، اسباب، مقاصد کو بے نقاب دیکھنے کے لئے، اس انداز کی کوئی اور کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔ اس نے اس تحریک کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔

ان دونوں کتابوں، اور پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کے ملنے کا پتہ

۱۔ مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

۲۔ ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

تصوّف

پرویز

[طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۵ء میں ـــ کشف و الہام کے سلسلہ میں کہا گیا تھا کہ تصوف کی تاریخ کے متعلق پرویز صاحب کا خط بنام سلیم شائع کیا جائے گا۔ سو وہ حاضرِ خدمت ہے۔ یہ خط ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اور ان تین خطوں میں سے کا پہلا خط ہے جو اس موضوع پر اسی زمانے میں شائع ہوئے تھے اور "سلیم کے نام" خطوط کی تیسری جلد میں درج ہیں۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے ان امور کو اپنی دو کتابوں ـــ "شاہکارِ رسالت" اور "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اربابِ ذوق کے لئے ان کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں ہوگا۔ سلیم کے نام خط، ابتدائی تعارف کے بعد درج ذیل ہے۔ طلوع اسلام]

اگرچہ تصوف (MYSTICISM) قریب قریب دنیا کی ہر قوم میں موجود ہے اور آج سے نہیں، بلکہ تاریخ کے اوّلین اوراق سے اس کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود مذہب (RELIGION) کی طرح اس کی بھی کوئی جامع اور مانع تعریف (PRECISE DEFINITION) آج تک نہیں ہو سکی۔ اس کا دائرہ بہت سے تجارب و کیفیات، احوال و مقامات اور شعائر و مناسک کو محیط ہے۔ لیکن ان میں دو بنیادی عناصر ایسے ہیں جو تصوف کی اصل سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی (۱) انسان کا خدا کے ساتھ براہِ راست مکالمہ اور (۲) نفسِ انسان کا حقیقتِ مطلقہ (یعنی خدا) کے ساتھ مل جانا۔ جسے وصال یا فنا کہتے ہیں۔ یہ تمام کیفیات ہر فرد کی ذاتی (یعنی انفرادی) ہوتی ہیں جن میں کوئی دوسرا فرد شریک نہیں ہوتا۔ نہ وہ فرد ان کیفیات کو کسی دوسرے کو محسوس کرا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے تصوف، بہ حیثیت ایک مذہب کے، یکسر شخصی یا ذاتی (PERSONAL RELIGION) ہوتا ہے اور یہ تجارب (EXPERIENCES) اس کائنات کے حسّی یا مشاہداتی علم کے بغیر ایک ایسے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں جو بالکل نگاہوں سے مستور اور حواس سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی کو باطنی ذریعۂ علم کہتے ہیں۔ اس علم کے حصول کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ نفسِ انسانی جب باطن کی گہرائیوں میں پہنچ جاتا ہے تو وہاں یہ اس حقیقتِ کلی میں جذب ہو جاتا ہے جو کائنات کے رگ و ریشے میں جاری و ساری ہے اور اس طرح نفسِ انسان اور حقیقت (REALITY) ایک ہو جاتے ہیں اور وہ بغیر کسی ذریعہ یا واسطہ کے تمام حقائق کا براہِ راست مشاہدہ کر لیتا ہے۔ مشاہدہ کیا کہ خود ہی حقیقت بن چکا ہوتا ہے۔ چونکہ حقیقتِ مطلقہ تمام مادی اور محسوس نسبتوں سے بلند اور منزہ ہے اس لیے نفسِ انسانی اس کے ساتھ اس صورت میں پیوستہ (یعنی اس کے اندر گم)

ہوسکتا ہے جب یہ خود تمام محسوس اور مادی علائق سے بلند اور پاک ہوجائے اس کے لیے نہ صرف دنیوی حظائظ و لذات سے ترکِ تعلق ضروری ہے بلکہ اپنے قلب و دماغ کو بھی اس مقام پر لے جانا ضروری ہوتا ہے جہاں اس میں محسوس دُنیا کے نقوش اور خیالات کا کوئی گذر نہ ہو۔ یعنی مادی دُنیا کی آلائش تو ایک طرف، محسوس اشیاء کے تصورات اور خیالات تک بھی دماغ میں نہ آنے پائیں۔ تصوف کی اصطلاح میں اس کیفیت کو "مکمل تاریکی" (COMPLETE DARKNESS) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دُنیائے محسوسات سے اس قدر دُور چلے جاتے ہیں کہ ان کے عقیدہ کی رُو سے وحی کے الفاظ بھی محسوسات میں داخل سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ انہیں چھوڑ کر وحی کا صحیح مفہوم اس باطنی دنیا سے متعین کرتے ہیں جس کا علم انہیں براہِ راست حاصل ہوتا ہے۔ اسے وہ حقیقت کا باطنی علم یا خود "حقیقت" کہتے ہیں۔ چونکہ وہ اس طریق سے حاصل کردہ علم کو بلاواسطہ علم (DIRECT KNOWLEDGE) کہتے ہیں اس کے لئے وہ اسے یکسر حتمی اور یقینی قرار دیتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں محسوسات کے ذریعہ سے حاصل کردہ علم کو ظنی اور غیر یقینی ٹھہراتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ اپنے علم کو دیگر تمام علوم کے مقابلہ میں افضل و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ یہ مقام انہیں مختلف جانکاہ مشقتوں اور جگر سوز ریاضتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جن میں بعض اوقات جان تک کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

[illegible] اقوام میں تصوف کے میلانات اور لزوم و خصائص۔

ظہورِ اسلام کے وقت دُنیا میں چار بڑے بڑے مذاہب تھے۔ یہودیت۔ نصرانیت۔ مجوسیت اور بدھ مت۔ آخر الذکر دونوں مذاہب (مجوسیت اور بدھ مت) میں وحی کا کوئی امتیازی اور خصوصی تصور نہیں تھا، اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ہاں ایک نبی کی وحی اور اربابِ تصوف کے کشف و الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔ لیکن یہودیت اور نصرانیت میں یہ فرق ضرور تھا، اگرچہ بہت مبہم طریق پر تھا۔ یہودی حضرت موسیٰ (علیہ) کو جس انداز کا نبی مانتے تھے، اس انداز کا نبی یرمیاہ، دانیال، یسعیاہ، حزقیل، وغیرہ کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ انہیں بھی نبی (PROPHETS) ہی کہتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے ہاں نبی کے معنی ہی تھے پیش گوئیاں کرنے والا۔ اسی لیے اس کا ترجمہ (PROPHETS) کیا جاتا ہے۔ اس لیے بادی النظر میں یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں ایک رسول کی وحی اور ایک ولی کے الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔ عیسائی اپنی انجیل کے مرتبین (لوقا۔ مرقس وغیرہ) کو سینٹ (ولی) کہتے ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰؑ کا ہم مرتبہ نہیں مانتے۔ (یہ غالباً اس لیے کہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کا مقام خدائی مقام ہے جس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا) ان کے بعد بھی ان کے ہاں اولیاء (SAINTS) ہی کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاں رسول کی وحی اور اولیاء کے کشف و الہام میں فرق ہے۔ لیکن (جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا) وحی اور الہام کا فرق (خواہ وہ عیسائیوں کے ہاں ہو یا مسلمانوں کے ہاں) صرف اصطلاحی فرق ہے۔ درحقیقت دونوں کی ایک ہی ہے۔ مسلمانوں کو یہ فرق زیادہ شدت سے کیوں کرنا پڑا، اس کے متعلق بھی بعد میں لکھا جائے گا۔

یہودیت ظواہر پرستی کا مذہب ہے اس لیے اس میں باطنیت کی گنجائش بہت کم تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد، بابل کی اسیری کے زمانہ میں، جب کہ قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی (اور یہی زمانہ تصوف کے ابھرنے کا ہوتا ہے) ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار شروع ہو گئے۔ چنانچہ اس دور

میں ان کے "نبیوں" (PROPHETS) کے احوال و ظروف کچھ اس قسم کے ہیں، جیسے باطنی خلوت گاہوں میں اربابِ تصوف کے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا اسلوبِ زندگی۔ وہی اندازِ گفتگو۔ اسی طرح کے مکاشفات اور الہامات۔ اسی نوع کی پیشگوئیاں۔ لیکن حقیقی تصوف ان میں اس کے بعد جا کر آیا۔ جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ فیلو (PHILO) اس مذہب کا امام ہے۔ تصوف کا ابوالآباء درحقیقت افلاطون (PLATO) کو سمجھنا چاہیئے۔ اس نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا تھا کہ اس عالمِ محسوس کے اوپر ایک عالم المثال ہے۔ وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم اس کا محض پرتو ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس حقیقی عالم کے متعلق علم حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ باطنی طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ افلاطون کے اس فلسفہ (یا بالفاظِ صحیح، تصوف) کی نشاۃِ ثانیہ بعد کے فلاسفروں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلاطینس (PLOTINUS) تھا۔ ان فلاسفروں میں ایک (APOLLONIOUS OF TYANA) نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے برہمنوں سے ہندی تصوف سیکھا۔ فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے مغوں سے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان فلاسفروں نے فلاطینس کی زیرِ کردگی افلاطون کے فلسفۂ قدیم کو ان ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر ایک جدید قالب میں ڈھالا۔ اس کا نام نو فلاطونی فلسفہ (NEO-PLATONISM) ہے۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو کا یہودی تصوف متاثر ہوا۔ اس تصوف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، معرفت اور حقیقت میں بدل گئی۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زوہار میں ہے کہ

> تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائے۔

تورات کی شریعت سب بنی اسرائیل کے لئے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف "خواص" تک محدود ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ مشناہ ("کتابِ حقیقت") میں لکھا ہے کہ

> کتاب پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دی جانی چاہیئے اس کی سخت ممانعت ہے۔ اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے۔ تاوقتیکہ اس نے مقام ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصل معانی اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک الگ طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروفِ ابجد میں عجیب و غریب ... ہے اور انہیں خاص خاص طریقوں سے اکٹھا کرنے اور دہرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیز ایک سے دس تک کے عدد بھی یہی خواص و تاثرات رکھتے ہیں۔ ان حروف اور اعداد سے متعلق کتاب زوہار میں ہے کہ

> خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے ساتھ کھیلا۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔

> انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا۔ اور ان کے مرکب مجموعوں سے کائنات کی ہر شے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم، علمِ حقیقی ہے اور اس سے انسان پر اسرار و رموزِ کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں۔ جب یہ راہیں کھلتی ہیں اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے "ربانی صوفیوں" (RABBINIC MYSTICS) کی شعبدہ بازیوں کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سبت کی شام کو رموزِ کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوتے۔ بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچھڑا نمودار ہو جاتا جسے وہ کھا جاتے۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے یہ اربابِ تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے اور خوابوں کی تعبیر سے زندگی کے مسائل کا حل بتاتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے۔ جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ) کی تعلیم (خدا کے ہر سچے نبی کی تعلیم کی طرح) ان خرافات کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی پیشوائیت ان کی جان تک کی دشمن ہو گئی۔ لیکن ان کی تشریف بری کے بعد خود عیسائیت ہی کچھ بن کر رہ گئی۔ ایک تو اس لئے کہ جو لوگ عیسائی ہوتے تھے وہ پہلے یہودی رہ چکے تھے۔ اور دوسرے اس لئے کہ عیسائیت اپنے ابتدائی دور ہی میں سخت نامساعد حالات کا شکار ہو گئی تھی اس لئے اسے بہت جلد، مجاہدانہ سعی و عمل کو چھوڑ کر، تصوف کی قرارگاہ میں پناہ لینی پڑی۔ بہرحال اب ہم عیسائیت کی طرف آتے ہیں۔

سلیم! غور سے سن رہے ہو یا موضوع کو خشک سمجھ کر جمائیاں لینے لگ گئے ہو؟ لیکن موضوع خشک ہے یار۔ اے صبا ایں ہمہ آوردۂ تست! اس لئے خود کردہ را علاج نیست۔ اب تو آخر تک بات سننی ہی پڑے گی۔

عیسائیت میں پہنچ کر تصوف نے ایک منظم مسلک (ORGANISED SYSTEM) کی شکل اختیار کر لی۔ اب باقاعدہ خانقاہیں قائم ہو گئیں۔ ان کے قواعد و ضوابط وضع ہوئے۔ ان میں داخلہ کی شرائط مقرر ہوئیں۔ ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے طور طریق متعین ہوئے جن پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ٹھہرائی گئی۔ اس روحانی ترقی کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کے زینے تجویز ہوئے۔ جگہ جگہ مختلف اولیاء (SAINTS) نے اپنے اپنے مرکز قائم کئے اور اس طرح پورا مذہب تصوف کی آماجگاہ بن گیا۔ اب ہر مقام پر اس قسم کے الفاظ دہرائے جانے لگے کہ

> اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھولو۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کرو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ جب آدم اور حوا کی جسمانی آنکھیں کھلی ہیں تو ان کی روحانی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ لیکن ان کے بعد یسوع مسیح آیا تھا کہ جن کی آنکھیں بند ہیں وہ دیکھنے لگ جائیں اور جو دیکھتے ہیں ان کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ پس یاد رکھو! حواس کی آنکھیں میچ لو اور دل کی آنکھیں کھول لو۔ پھر خدا اور اس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آ سکے گا۔ (ST. ORIGEN)

اس مقصد کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ علائق، ترکِ خیالات اور ترکِ آرزو "خاکیہ" روحانیت کے علاوہ ہر شے کا ایک قرینہ قرار پا گیا اور حقیقی زندگی اسے سمجھا گیا جس میں انسان ہر وقت ۔۔ گوش بند و چشم بند و لب ببند ۔۔ کی حالت میں مراقبہ میں بیٹھا "رموز و اسرارِ کائنات" کے جلوے دیکھتا رہے۔

> وہ عالم غیب۔ وہ دنیائے نور۔ وہ بلند سے بلند تر مقام جہاں سادہ، غیر متبدل اور مطلق حقیقتیں باطنیت کی مضمر خاموشیوں کی نورانی قباؤں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ان کے جلوے دیدۂ ظاہر بین سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ انہیں دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے حواس کو بھی پیچھے چھوڑ دو اور عقل و خرد اور شعور و ادراک کو بھی۔ یعنی ہر اس چیز کو جو عقل و حواس کے ذریعے سمجھ میں آ سکتی ہے خواہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ سب کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو ان تمام حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ یاد رکھو! اگر تم میں ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی باقی رہی جن سے وہ ماوراء ہے تو تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اس کے نور کی شعاع کامل تاریکی میں نظر آیا کرتی ہے۔ کامل تاریکی میں (DONYSIUS)

اس کے لئے ترک دنیا، مرشد کی اطاعت، خاموشی اور انکساری اوّلین شرائط ہیں (ST. BENEDICT)۔ ان طریقوں سے ایک تارک الدنیا زاہد کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

> اسے ایک نور کی چادر اڑھا دی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔ تاآنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ تکمیل نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور آخر الامر وہ خود حقیقت مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔ (ST. MACARIUS)

خدا اور انسانی روح کے اس تعلق کو (ORIGEN) "عروسی تعلق" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دوسرے ولی (SAINTS) بھی اسے "آسمانی دلہن" (HEAVENLY SPOUSE) کہہ کر پکارتے ہیں (اس اصطلاح کو ذرا اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ اس لئے کہ یہی وہ تصور ہے جو آپ کے ہاں عرس کے رنگ میں رائج اور فقیری "دلہنوں" کی صورت میں جلوہ بار ہے۔) چونکہ اس طرح زہد و انزوا کی زندگی بسر کرنے والے، لوگوں کی نگاہوں میں بے حد مقبول اور واجب التعظیم قرار پاتے تھے۔ اس لئے رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ لوگ فوج در فوج اس مسلک کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ بستیاں خالی ہو رہی تھیں۔ اور خانقاہیں آباد۔ شام اور فلسطین کے علاقے خاص طور پر اس مشرب خانقاہیت کے مراکز تھے۔

یہ تھے اس وقت کے حالات جب اسلام کا ظہور ہوا۔ میں نے سلیم! قصداً ایران اور ہندوستان کے تصوف کا تذکرہ اس مقام پر نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ اس وقت عرب اور اس کے گردوپیش یہودی اور نصرانی ہی پھیلے ہوئے تھے۔ ہند و ایران کے ساتھ ان کے روابط و علائق براہ راست نہیں تھے۔ یوں بھی یہودی اور نصرانی تصوف، ایران کے مجوسی (مانوی) تصوف اور ہندوستان کے بودھی تصور فنا اور وحدت وجود کو اپنے آغوش میں لے چکے تھے۔ ہندی تصوف (ویدانیت) کا سب سے بڑا پرچارک شنکر اچاریہ ہے۔ اس کے نزدیک اصل علم آتم ودیا یا معرفت نفس ہے۔ وہ روح کو ازلی اور غیر فانی مانتا ہے اور خارجی کائنات کو فانی

اس کی تعلیم یہ ہے کہ برہما ادراک سے بالاتر ہے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ وجدان ہے۔ کائنات اور اس کی تمام اشیاء سراب (مایا) ہیں۔ "میں" بھی مایا ہے۔ ترکِ خواہشات کے ذریعے انسان مایا کے فریب سے نکل سکتا ہے۔

شنکر اچاریہ کے بعد اس مذہب (ویدانیت) کا مبلغ تیتجلی ہے جو وحدت وجود کا قائل ہے۔ "اہم برہم آسمی" میں ہی برہما ہوں اسی کا مشہور مقولہ ہے۔

اب ہم اسلام کی طرف آتے ہیں۔ اس لئے اب جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھو تاکہ تمہاری یہ الجھن ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے اور اس کا نتیجہ کی الجھن تمہیں پھر نہ ستائے۔ یہودیت یا نصرانیت کے مقابلے میں اسلام کے متعلق صحیح بات تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ (علیہ) اور حضرت عیسیٰ (علیہ) نے اپنے پیغام کو لوگوں کے سامنے کن الفاظ میں پیش کیا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلعم نے اپنے پیغام کو جن الفاظ میں دنیا تک پہنچایا تھا اس کا ایک ایک حرف قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ نظر موضوع کے متعلق قرآن کی تعلیم کیا ہے۔

قرآن نے سلیم! یہ کہا ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل و فکر دی ہے، اور اسے بار بار تاکید کی ہے کہ وہ کائنات کے نظام پر غور کرے ان قوانین کا علم حاصل کرے جن کی رو سے یہ اتنا عظیم الشان اور محیر العقول کارخانہ .. .. اس حسن و نظم سے چل رہا ہے۔ اس طرح وہ کائناتی قوتوں کا راز پا لے گا جو اس کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں اور جب ان کا راز پا لے گا (یعنی یہ معلوم کرے گا کہ وہ کس طرح کام کرتی ہیں) تو ان سے بے شمار فوائد حاصل کر سکے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اشیائے کائنات سے جو مفاد حاصل ہوتے ہیں انہیں کس طرح صحیح مصرف میں لایا جائے۔ یہ وہ سوال ہے جسے تنہا انسانی عقل حل نہیں کر سکتی۔ ان کا استعمال ان مستقل اقدار کے مطابق کرنا ہوگا جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لئے متعین کیا ہے۔ ان کا علم اسے وحی کے ذریعے مل سکے گا۔ وحی کو انسان اپنی محنت اور کسب و ہنر سے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ یعنی انسان از خود انکشافِ حقیقت نہیں کر سکتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود انسان پر منکشف (REVEAL) کرتی ہے۔

لیکن یہ انکشافِ حقیقت (وحی) ہر انسان پر نہیں ہوتا۔ یہ انکشاف خاص خاص انسانوں پر ہوتا ہے۔ جنہیں نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ وہ انسان، اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم وہ آخری انسان تھے جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملی۔ یہ وحی قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ رسول اللہ صلعم کے بعد، انسانوں کے پاس علم کے ذرائع صرف دو ہی رہ گئے۔

(۱) خدا کی وہ راہنمائی جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اور

(۲) انسانی عقل۔

ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعہ علم نہیں جس کا ذکر قرآن میں ہو۔ اس میں کشف، الہام، باطنیت، "اندرونی روشنی" وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں صوفی یا تصوف کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس میں اولیاء کے کسی گروہ کا الگ تذکرہ نہیں وہ جماعت مومنین ہی کو اولیاء اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں "انسانی روح کے خدا کے اندر جذب ہو جانے" کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کی اصطلاحات کا کوئی گزر نہیں اس میں واصل بالحق ہونے یا "معروسی" درجہ حاصل ہونے کا اشارہ تک نہیں۔ باقی رہا قرآن، سو اس کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ عربی زبان کی ایک کتاب ہے۔ اس کی زبان بڑی صاف، واضح اور روشن ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ نہیں، کوئی پیچ نہیں، خم نہیں، ابہام نہیں۔ کوئی تہ دار بات نہیں۔ اس پہ غور و فکر کرنے سے اس کے معانی آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر محسوس امور ہی سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن جہاں کہیں مجرد حقائق (ABSTRACT TRUTHS) کا ذکر آیا ہے تو (جیسا کہ ایک بلند پایہ کتاب کا انداز ہوتا ہے) انہیں محسوس تشبیہات میں بیان کر دیا گیا ہے۔ انہی کو سلیم! متشابہات کہتے ہیں۔ ان میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان تشبیہات سے کیا بات سمجھانی مقصود ہے۔ اور یہ چیز علم کی پختگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کے الفاظ کا کوئی باطنی مفہوم ہے جسے صرف خاص خاص لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ تمام نوع انسان کے لئے راہ نمائی کا ضابطہ ہے اس لئے اس کے مطالب تمام نوع انسان کے سامنے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ اس میں نہ زمان کی قید ہے، نہ مکان کی۔ وہ خود روشن (نور) ہے اور جو بھی اس سے راہ نمائی حاصل کرنا چاہے اسے روشنی عطا کر دیتا ہے۔

یہ ہے قرآن کی پوزیشن۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اسے سلیم! سامنے رکھو اور پھر غور کرو کہ قرآن نے کس طرح تصوف کی اصل و بنیاد کو ختم کر دیا۔ تم نے شروع میں دیکھا ہے کہ تصوف کی عمارت ان اقانیم ثلاثہ پر قائم ہوتی ہے:-

(۱) ہر انسان خدا کے ساتھ براہ راست ہم کلام ہو سکتا ہے۔ (قرآن نے ختم نبوت کا اعلان کر کے، خدا سے براہ راست ہم کلام ہونے کا دروازہ بند کر دیا)۔

(۲) انسانی روح، خدا کی ذات کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو کر مادی دنیا میں چکر کاٹ رہی ہے۔ آخر الامر یہ خدا کی ذات میں جا کر جذب ہو جاتی ہے یہ انسانی زندگی کا منتہیٰ اور کمال ہے (قرآن نے خدا کو ایک مکمل ذات بتا کر اس باطل تصور کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔ اس نے کہا کہ انسان کی ذات، خدا کی ذات کا حصہ نہیں جو اس سے الگ ہو کر مصروف آہ و بکا ہے اور اس پھر اپنی اصل سے مل جانا مقصود حیات۔ کوئی ذات نہ کسی دوسری ذات کا حصہ ہوتی ہے نہ اس میں جذب ہو سکتی ہے۔ انسان کی ذات خدا کی عطا کردہ ہے اور اس کی نشوونما انسانی زندگی کا فریضہ۔ یہ ذات مناسب نشوونما سے حیات جاوید حاصل کر سکتی ہے لیکن خدا کی ذات میں جا کر جذب نہیں ہو جاتی)۔

(۳) آسمانی کتابوں کے حقیقی معانی ان کے الفاظ میں نہیں ہوتے۔ ان کے باطنی معنی ہوتے ہیں جو کشف و الہام سے سمجھ میں آسکتے ہیں (قرآن نے کشف و الہام کے امکان کو ختم کر کے اور اپنے آپ کو عربی زبان کی واضح کتاب کہہ کر اس تصور کو سرے سے مٹا دیا)۔

(۴) صاحبان کشف و الہام سے کرامات سرزد ہوتی ہیں؟ قرآن نے کہا کہ صاحبان کشف و الہام تو کجا رسول اکرمؐ کو قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ حقیقت کو دلائل و براہین کی رو سے منوایا جاتا ہے۔ نہ کہ خارق عادات کرشمے دکھا کر۔

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! (میرا خیال ہے کہ) تم بے ساختہ کہہ اٹھو گے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ قرآن اور تصوف بالکل متضاد بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارتیں ہیں۔ اور قرآن فی الواقعہ تصوف کی باطل عمارت کو منہدم کرنے کے لئے آیا تھا۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت ہی نہیں لیکن چونکہ تم نے یہ بھی پوچھا کہ پھر اسلام میں تصوف آ کہاں سے گیا؟ اس لئے اس کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں لکھنا ضروری ہو گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو کہ، اور تو اور، خود صوفی بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ لفظ تصوف کے بنیادی معنی کیا ہیں؟ اس کا مادہ کیا ہے اور صوفی کو صوفی کیوں کہتے ہیں؟ بعض اس لقب کو اصحاب صُفّہ کے نام سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ [یعنی وہ صحابہؓ جو مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں پناہ گزینوں (REFUGEES) کی طرح بے سرو سامانی کی حالت میں مسجد نبویؐ کے ایک چبوترے پر رہا کرتے تھے] بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صَفا سے مشتق ہے۔ بعض اسے یونانی لفظ صوفیا (SOPHIE) سے ماخوذ سمجھتے ہیں جس کے معنی عقل و دانش کے ہیں اور جو لفظ فلسفہ (PHILOSOPHY) کی ترکیب میں شامل ہے۔ لیکن اکثر کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ صوف (اون) کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ اون کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے[1] مشہور ہوا ابوالہاشم عثمان بن شریک تھا اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ ۱۴۰ھ میں رملہ کے قریب جو (فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔ ابو ہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا اور اٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آ گیا۔ یہاں ۱۶۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ صوفیوں کی پہلی خانقاہ فلسطین میں قائم ہوئی جو عیسائیوں کے مسلک خانقاہیت کا مرکز تھا لیکن تصوف کے بنیادی تصورات کو اسلام میں ایرانیوں نے داخل کیا۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کو جتنی بڑی شکست دی تھی وہ اس کا بدلہ جنگ کے میدان میں نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے میدان تجویز کئے۔ وہ مسلمان ہو کر اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں آ گئے اور یہاں پہنچ کر اپنے آبائی تصورات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز قرآن کی تعلیم میں ہے۔ اس لئے وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان کو قرآن سے بیگانہ نہ بنایا جائے اس کی قوت میں ضعف نہیں آ سکتا۔ وہ قرآن کے الفاظ کو چھیڑ نہیں سکتے تھے اس لئے کہ اس کی حفاظت کا انتظام بڑا پختہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم یکسر بدل جائے۔ اس کے لئے ایک طریقہ تو یہ تھا جسے

---

[1] تفصیل اس اجمال کی پرویز صاحب کی کتاب "شاہکار رسالت" میں ملے گی جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی ہے (طلوع اسلام)

(مثلاً) طبری نے اختیار کیا۔ یعنی ہر آیت کی تفسیر کے لئے کوئی نہ کوئی روایت وضع کر لی اور اس آیت کے معنی اس روایت کی رو سے یہ کہہ کر دیئے کہ یہ معنی خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے الفاظ تو وہی رہے لیکن ان الفاظ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں اس وقت سے آج تک متوارث چلا آ رہا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ قرآن کے اصلی معنی اس کے الفاظ سے متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کے الفاظ کے نیچے ایک باطنی مفہوم ہے جو قرآن کا مغز اور اس کی روح ہے۔ وضعی روایات کی رو سے قرآن کی تفسیر کا سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا۔ کیونکہ روایات، جس قدر بنائی ممکن تھیں۔ اس زمانہ میں بن گئیں۔ لیکن اس باطنی طریق سے تفسیر کا طریق ہمیشہ کے لئے جاری رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ اس طریق سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ۔

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل وشعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبال نامہ ج ا صفحہ ۳۵)

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خط میں قرآن کے باطنی مفہوم کے علاوہ، وحدت الوجود کے فلسفہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے کسی اور وقت لکھا جائے گا۔ سردست تم اس نکتہ کو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ جیسا کہ حضرت علامہ نے لکھا ہے، قرآن میں باطنی مفہوم پیدا کرنا اسے منسوخ کر دینے کا ایک نہایت لطیف اور پُر فریب طریقہ تھا جسے مسلمانوں میں اس طرح رائج کر دیا گیا۔ جیسا کہ تم پہلے دیکھ چکے ہو، یہ وہی چیز تھی جو یہودی، عیسائی اور ایرانی تصوف میں ہر جگہ موجود تھی۔ لہٰذا یہی تصور یہ مسلمانوں میں جہاں ایک اسماعیلی تحریک کا موجب بنا دوسری طرف اس نے تصوف کی بنیاد ڈال دی۔

جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، باطنی معنی کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ ہر انسان کوشش کرنے سے، کشف و الہام کے ذریعے ان معانی کو براہ راست خدا سے حاصل کرتا ہے۔ یعنی خدا اور بندہ کی براہ راست ہمکلامی کا تصور۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ جہاں باطنی مفہوم کے تصور نے قرآن کو عملاً منسوخ کر دیا، وہاں رسول اللہؐ کے بعد،

کشف و الہام کے عقیدہ نے ختم نبوت کی مہر کو بھی توڑ دیا۔ وحی اور الہام میں صرف لفظی فرق ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ دونوں کی عمارت اس بنیاد پر اٹھتی ہے کہ انسان کے پاس عقل کے علاوہ ایک اور ذریعہ علم بھی ہے جس سے وہ خدا سے براہ راست معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اس طریق سے حاصل کردہ معلومات کو قرآن کی رو سے وحی کہا جاتا ہے۔ اور تصوف کی زبان میں الہام۔ لہذا ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہؐ کے بعد، الہام کا امکان جاری رہے تو ختم نبوت کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ رسول اللہؐ کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، کشف و الہام ہی کی رو سے کیا ہے۔[1]

اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جب الہام کے امکان سے ختم نبوت جیسے بنیادی عقیدہ کی تردید ہو جاتی ہے تو مسلمانوں میں اس عقیدہ کو رائج کیسے کر دیا گیا؟ اس کے لئے ایک بڑا خوبصورت طریقہ اختیار کیا گیا۔ پہلے یہ کہا گیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا۔ اسے وحی خفی، یا وحی غیر متلو کا نام دیا گیا (واضح رہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مسلمان ان اصطلاحات سے آشنا تک نہ تھے) اس عقیدہ نے دو کام کئے۔ ایک طرف ان روایات کو وحی کا درجہ حاصل ہو گیا جو قرآن کی تفسیر یا "اسلام کی تکمیل" کے لئے وضع کی جا رہی تھیں اور دوسری طرف قرآن کے باطنی مفہوم کے لئے سند ہاتھ آ گئی۔ اس کے علاوہ اس سے انہیں ایک اور بڑا فائدہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو یہ خدشہ تھا کہ ارباب شریعت کی طرف سے باطنی مفہوم کی مخالفت ہو گی، لیکن جب ارباب شریعت نے اس اصول کو مان لیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا اور ختم نبوت کے معنی سلسلۂ وحی کا ختم ہو جاتا ہے، نہ کہ سلسلہ الہام کا۔ تو وہ اصولاً اہل باطن کی مخالفت کر ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ اس قسم کی روایات خود ہماری کتب احادیث میں موجود ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے مجھے دو برتن عطا فرمائے تھے۔ ایک کو تو میں نے کھول کر عام کر دیا ہے (یہ شریعت کا علم ہوا) لیکن اگر دوسرے کو کھول دوں تو میری شاہ رگ کاٹ دی جائے (یہ ہوا باطن کا علم جو سینہ بسینہ آگے چلتا ہے) ۔ باقی رہیں خانقاہوں کی ریاضتیں۔ سو ان کے لئے اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ رسول اللہؐ بعثت سے پہلے، پانی اور ستو لے کر غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کئی کئی روز تک مصروف مراقبہ رہتے تھے۔ انہی ریاضتوں کا نتیجہ خدا کی طرف سے وحی کا ملنا تھا۔ یہ تھے مختصر حربے جن سے قرآن کے علی الرغم، باطنیت جیسا قرآن کا دشمن عقیدہ عام ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف یہودیت اور نصرانیت کے تصوف نے پہلے ہی سے فضا کو ان خیالات سے معمور کر رکھا تھا۔ جو یہودی یا نصرانی مسلمان ہوئے انہوں نے اس کو اپنے قدیمی رجحان کے عین مطابق پایا۔ اس لئے انہوں نے اسے لپک کر گلے سے لگا لیا، نتیجہ یہ کہ تیسری صدی ہجری میں خود مسلمانوں میں اسی زور شور سے خانقاہیں کھلنی شروع ہو گئیں جس طرح اس سے پہلے عیسائیوں کے ہاں ہوا تھا۔

اگر تصوف کے سلسلہ کی ابتدا، ان لوگوں کے نام سے کی جاتی جنہوں نے فی الحقیقت اس کی ابتدا کی تھی

---

[1] اس کی تفصیل پرویز صاحب کی کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں ملے گی جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی ہے (طلوع اسلام)

تو ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ خیال گزرتا کہ یہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان حضرات نے باطنی طور پر سلسلہ بسلسلہ رسول اللہؐ سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور چونکہ یہ تصوف سبائیوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس لئے اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نمایاں طور پر درمیان میں لایا گیا اور انہیں شاہِ ولایت کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اب صوفیوں کے مختلف "شجروں" کا منتہیٰ حضرت علیؓ ہی قرار پاتے ہیں۔ مثلاً حضرت جنیدؒ مرید تھے حضرت سری سقطیؒ کے۔ سری سقطیؒ مرید تھے حضرت معروف کرخیؒ کے۔ معروف کرخیؒ مرید تھے داؤد طائیؒ کے۔ داؤد طائیؒ مرید تھے حبیب عجمیؒ کے، حبیب عجمی مرید تھے خواجہ حسن بصریؒ کے اور خواجہ حسن بصریؒ مرید تھے حضرت علیؓ کے جنہوں نے یہ باطنی علم رسول اللہؐ سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ تاریخ میں اتنی شہادت بھی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات کبھی حضرت علیؓ سے ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ میں خواجہ حسن بصریؒ لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین اور احکام وقت کی اطاعت کی تاکید کرتے تھے۔ اگرچہ مجھے تو اس میں بھی شبہ نظر آتا ہے۔ ان کی پیدائش ۲۱ ھ میں بتائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ کے زمانہ میں یہ بمشکل سولہ سترہ برس کے ہو سکتے ہیں۔ اتنی سی عمر میں ان کی ایسی بڑی پوزیشن بمشکل باور کی جا سکتی ہے کہ یہ اتنے جیسے اہم معاملہ میں لوگوں پر کوئی اثر رکھتے ہوں۔ لیکن یہ باتیں تو اہلِ ظواہر کی ہیں۔ صوفیا کے نزدیک زمان و مکان کا بعد کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور سب کچھ بیٹھے بٹھائے ایک لمحہ میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری میں حضرت جنید (م ۲۹۸ ھ) کے ایک مرید نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے پیر و مرشد کو خرقۂ تصوف حضرت انس بن مالکؓ سے ملا تھا جو رسول اللہؐ کے صحابی تھے۔

میرا خیال ہے سلیم! تم اس مختصر سی سرگزشت سے یہ سمجھ گئے ہو گے کہ تصوف کے جراثیم اسلام میں کہاں سے، اور کیسے آئے۔ اس خط میں تصوف کی پوری تاریخ بیان نہیں کی جا سکتی، لیکن چلتے چلتے ایک ایسی شخصیت کے متعلق دو چار باتیں ضرور سن لو جس نے تصوف کو ایک مستقل مذہب کی حیثیت دے دی اور جس کے سحر پرور دام سے ملتِ اسلامیہ اس وقت تک سنبھل نہیں سکی۔ یہ تھے ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدین ابن عربی جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے۔ اور جن کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم تصوف کا عروۃ الوثقیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ یہی فصوص الحکم جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ

جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں (اقبال نامہ ج ا صفحہ ۴۴)

یہ چھٹی ہجری میں اندلس میں پیدا ہوئے اور ۶۳۸ ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ جہاں ان کے مزار پر ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ اس زمانہ میں ہسپانیہ میں متصوفین فلاسفرز کا ایک گروہ تھا جو وحدت الوجود کے قائل تھے۔ وہ اپنی کیفیات اور احوال کو تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں بیان کیا کرتے اور اپنے عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کے جاذب نگاہ لباس میں پیش کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی انہی سے متاثر ہوئے۔ انہی کا فلسفہ انہی کا انداز بیان حتیٰ کہ انہی کا سا عشق مجازی بھی۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ جب وہ مکہ میں مقیم تھے تو ایک دوشیزہ کی طرف ان کا میلان ہو گیا تھا اور ان کے اکثر مکاشفات کا روحانی جذبہ اسی کے عشق کا رہینِ منت ہے۔ ان کے ملفوظات

اور یہودی تصوف کی بنیادی کتاب "زہار" میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں الہامی کتابوں کی تاویل اپنے ذاتی مکاشفات کی بناء پر کرتے ہیں۔ حروف اور اعداد سے پُراسرار معانی اخذ کرتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر حقائق کی عمارتیں تعبیر کرتے اور انسانی مقدر کو ستاروں کے اثرات کے تابع مانتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں وحدت وجود کا عقیدہ بدھ مت سے آیا ہے۔ لیکن یہ کہیں سے بھی آیا ہو اسے ایک منظم مذہب کی حیثیت ابن عربی نے ہی دی ہے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ وہ اس کی سند بھی قرآن سے پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ لیکن وہ سندیں کس قسم کی ہیں، اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ قرآن کریم میں زمین کے متعلق ہے کہ منها خلقنکم وفیها نعیدکم ومنها نخرجکم تارة اخری۔ (۲۰/۵۵) اس کا صاف ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں باردیگر نکالیں گے۔ ابن عربی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

> ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے، پھر بقا ملے گی اور دوبارہ نمودار ہوں گے (فصوص الحکم)

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جس بنیادی عقیدہ کی رو سے تصوف اسلام کے مدِ مقابل کھڑا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد خدا کے ساتھ براہ راست ہمکلامی کا سلسلہ جاری ہے۔ ابن عربی کا عقیدہ ہے کہ ارباب باطن، دین کے متعلق اپنے علم کو خدا اور رسول دونوں سے براہ راست حاصل کرتے ہیں۔ خدا کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ

> جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل صاحب الزمان، غوث قطب لیتے ہیں۔

اور احادیث کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ احادیث

> روایت بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔ لہذا اولیاء ان کے متعلق رسولؐ خدا سے براہ راست دریافت کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحب وحی دونوں ہوتے ہیں ..... اگرچہ رسول اللہ کے خلفاء (یعنی اولیاء) دائرہ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن یہاں ایک دقیقہ ہے جسے ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں۔ اور وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرع رسولؐ پہ حکم کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہاں سے حکم دیتے ہیں؟ ارباب شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مُصّرح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہذا خود اس حکم شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادہ کشف و الہام اور مادہ وحی رسول ایک ...

[illegible]

ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہے ...... ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہؐ کا لینا ہے ..... یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے منصوص و معین طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ ان کی اُمت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالےٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہوں گے ...... پس خلق خدا میں خلیفۃ اللہ ہیں - وہ معدن خاتم النبیین و مادہ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انہوں نے لئے تھے ...... خدا تعالےٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے - اگرچہ خلیفہ، ولی ظاہر میں متبع نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے -

دوسری جگہ یہ صاحب لکھتے ہیں :

کبھی خلیفہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم حدیث کے خلاف ہے - لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا اجتہاد ہے - حالانکہ واقعہ ایسا نہیں - اصل یہ ہے کہ اس کے کشف کی رو سے یہ حدیث ثابت نہیں، اگرچہ وہ حدیث عن عدل عن عدل سے ثابت ہو -

میں سلیم اس ضمن میں، اور بھی بہت کچھ نقل کر دیتا، لیکن ایک تو خط میں اتنا کچھ آ نہیں سکتا اور دوسرے میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی اصلاحی چیزوں سے تمہاری طبیعت بہت جلد اکتا جایا کرتی ہے - لیکن جتنا کچھ میں نے لکھا ہے اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ایک نبی کی وحی اور ان لوگوں کے الہام میں صرف اصطلاحی فرق ہے - معنوی طور پر کچھ فرق نہیں - دونوں کا مفہوم خدا سے براہ راست علم حاصل کرنا ہے - یہ لوگ کہہ دیتے ہیں اگرچہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہوتا ہے - لیکن وحی یقینی علم ہوتا ہے اور الہام ویسا یقینی نہیں ہوتا - لیکن فرق صرف کمیت (QUANTITY) یا درجہ (DEGREE) کا فرق ہے - کیفیت (QUALITY) یا نوعیت کا فرق نہیں - سرچشمہ (SOURCE) ان دونوں کا ایک ہے - یعنی خدا سے براہ راست حاصل کردہ علم۔ اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا سلیم! کہ جب الہام کے امکان کو مان لو پھر نبوت کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے - جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے، مسلمانوں میں تمام مدعیان نبوت اسی راستہ سے آئے ہیں۔ اس کشف و الہام کی رو سے قرآن کو جو باطنی معنی پہنائے جاتے ہیں، ایک آدھ نمونہ اس کا بھی دیکھ لو تاکہ بات نکھر کر تمہارے سامنے آ جائے - ابن عربی، فصوص الحکم، کلمہ موسویہ میں لکھتے ہیں کہ

فرعون کے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے میں کیا حکمت تھی اور کیا راز تھا؟ اس کا راز یہ تھا کہ جو جو لڑکے موسیٰ کے واسطے مارے گئے تھے ان کی زندگی سے موسیٰ کو امداد ملے - کیونکہ وہ لڑکے موسیٰ سمجھ کر مارے گئے تھے تو ضرور ان سب بچوں کی حیات جو موسیٰ سمجھ کر مارے گئے تھے حیاتِ موسوی کی طرف عود کرے گی - ان معصوم بچوں کی حیات

ظاہر تھی، فطرت پر تھی بلکہ وہ قالو بلیٰ کے عہد پہ قائم تھے۔ لہذا موسیٰ ان سب مقتولین
کی حیات کا مجموعہ تھا۔ وہ بہت سی روحوں کا مجموعہ تھا اور بلند مقام پہ تھا کیونکہ بچہ کو اللہ
کے پاس سے آئے ہوئے تھوڑی مدت ہوتی ہے۔

آگے چل کر یہ صاحب یہ کہنے کی بھی جرأت کرتے ہیں کہ فرعون ایمان پہ مرا تھا اور اس کی بخشش ہو چکی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو یہاں تک بھی لکھ گئے ہیں (جس کے نقل کرنے سے میرا قلم تھرتھراتا اور روح کانپتی ہے) کہ

پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے انا ربکم الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذات حق
سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی

اور ایک ابن عربی پر ہی کیا موقوف ہے۔ دیگر بڑے بڑے صوفیا کے ہاں بھی اسی قسم کی شطحیات ملتی ہیں۔ رومی کہتا ہے۔

می گفت در بیابان رند دھن دریدہ
صوفی خدا ندارد او نیست آفریدہ

ان لوگوں کے نزدیک کفر اور اسلام میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ

کفر و دین است در رہت پویاں
وحدہٗ لا شریک لہ گویاں

میرا یہ خیال ہے کہ تم ان مثالوں سے سمجھ گئے ہوگے کہ وہ جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ فصوص الحکم میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں، تصوف کا تمام لٹریچر اسی قسم کے الحاد و زندقہ سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ صوفیا میں بعض ایک دوسرے کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ مثلاً وحدت شہود کے مدعی وحدت وجود کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن تصوف کی اصل و بنیاد کو سب محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جو شخص اس کی طرف انگلی اٹھائے اس کی مخالفت میں سب متفق ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی مخالفت نے آجکل ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ یعنی عجمی تصوف اور اسلامی تصوف۔ اس امتیاز کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔ ایک چیز ہے تصوف اور ایک چیز ہے تصوف کا ضابطۂ اخلاق (ETHICS OF MYSTICISM) تصوف کا ضابطۂ اخلاق یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑ دو، آرزؤں کو ترک کرو، محکومی اور سربزیری کی زندگی بسر کرو، افلاس اور محتاجی کو خدا کی رحمت سمجھو، قوت اور شوکت کو خوشۂ دو زندگی جانو اور مسلک گوسفندی اختیار کرو۔ ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے تصوف کے اس ضابطۂ اخلاق کی سخت مخالفت کی اور قرآن کے پر شکوہ اور باعظمت، زندہ اور زندگی بخش مسلک حیات کی عام تبلیغ کی۔ چونکہ اہل تصوف اس دور میں یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ ضابطۂ اخلاق فی الواقعہ اسلام تعلیم کا مظہر ہے اس لئے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ عجمی تصوف ہے، اسلامی نہیں۔ یعنی یہ لوگ جس تصوف کے وارث ہیں وہ اسلامی ہے اور جس تصوف کی مخالفت ہو رہی ہے وہ عجمی ہے۔ حالانکہ تصوف، نہ عجمی ہے نہ اسلامی۔ یہ ایک غیر اسلامی تصور ہے جو غیر مسلموں میں بھی پایا جاتا

ہے۔ اور مسلمانوں میں بھی۔ جس طرح جھوٹ، مسلمانوں کے ہاں آ کر سچ نہیں بن سکتا، اسی طرح کوئی غیر اسلامی نظریہ مسلمانوں کے ہاں پاکر اسلامی نہیں بن سکتا۔ یہ کہنا کہ حافظ کا تصوف عجمی ہے اور رومی کا تصوف اسلامی، تصوف کی اصل و بنیاد سے ناواقفی نہیں تو اور کیا ہے۔

ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ضابطہ اخلاق کا ہے۔ نہ کہ تصوف کا۔ مثلاً حافظ کے ہاں سکوت و سکون ہے اور رومی کے ہاں اکثر مقامات پر حرارت اور گرم جوشی۔ لیکن اس کے باوجود دونوں صوفی ہیں۔ بلکہ رومی اس باب میں حافظ سے بھی زیادہ شدید صوفی ہے۔ وہ باطنی ذریعہ علم کو حافظ سے بھی زیادہ قابل اعتماد قرار دیتا ہے۔ جہاں تک قرآن کے باطنی مفہوم کا تعلق ہے۔ رومی کا یہ دعویٰ ہے کہ

ما ز قرآں مغز را برداشتیم ۔۔۔ استخواں پیش سگاں انداختیم

یہ "مغز" وہی ہے جسے باطنی مفہوم کہا جاتا ہے اور "استخواں" (معاذ اللہ معاذ اللہ) وہ قرآن ہے جو عربی الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ جب مثنوی کو "قرآن در زبان پہلوی" کہنے والوں کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا جائے تو وہ کھسیانے سے ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ مولانا کا اس سے مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے معانی لے لئے ہیں۔ الفاظ سے ہمارا سروکار نہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کیا دنیا میں بغیر لفظ کے بھی کوئی معنی ہوتا ہے؟ تو تم سمجھے سلیم! کہ یہ کیا بات ہوئی۔ بات وہی ہوئی جو ہم نے اوپر لکھی ہے کہ یہ حضرات اس مفہوم کو اصل مفہوم سمجھتے ہی نہیں جو قرآن کے الفاظ سے متعین ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کا صحیح مفہوم وہ ہے جو انہیں کشف و الہام کے ذریعہ براہ راست خدا سے ملتا ہے۔ اور یہی ہے تصوف کی وہ بنیاد جو قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ لہٰذا اس بنیاد کی رو سے نہ رومی کا تصوف اسلامی ہو سکتا ہے نہ حافظ کا۔ تصوف فی ذاتہٖ ایک غیر اسلامی نظریہ ہے اور اقبال کے الفاظ میں "سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے۔"

(مکتوب بنام سید سلیمان ندوی مرحوم)

بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ تصوف سے مراد "اخلاص فی العمل" ہے۔ یعنی نیک کام دکھاوے کی خاطر نہ کئے جائیں بلکہ مخلصانہ طور پر خدا کی رضا جوئی کی خاطر کئے جائیں۔ ذرا سوچو سلیم! کہ کیا اسلام یہ سکھاتا ہے کہ نیک کام ریاکاری سے کئے جائیں؟ جو اخلاص فی العمل کے لئے اسلام کو چھوڑ کر تصوف کی الگ اصطلاح کی ضرورت پڑ گئی؟ قرآن ریاکاری اور منافقت کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں پھینکتا ہے۔ اس نے ریاکاروں کے لئے منافق اور مخلص کے لئے مومن کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان قرآنی اصطلاحات کو چھوڑ کر ہمیں اور اصطلاحات تلاش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ بالخصوص جبکہ وہ اصطلاحات (تصوف اور صوفی) اس قدر غیر قرآنی تصورات کی حامل ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ تصوف کی مدافعت کی کوشش کرتے ہیں ان کی اس کوشش کا جذبہ محرکہ وہی ہوتا ہے جو دیگر غیر قرآنی معتقدات و تصورات کی مدافعت میں کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ۔ تصوف میں پہنچ کر یہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے اس لئے کہ صوفیا (اولیاء اللہ) کا مرتبہ ان کے معتقدین کے دل میں ہوتا ہے وہ خدا کا بھی ہوتا[1] لہٰذا وہ

---

[1] رند مشرب شعراء جس طرح (معاذ اللہ) خدا سے کھیلتے رہتے ہیں، سب پر واضح ہے۔ (طلوع اسلام)

لہٰذا وہ اس بات کا خیال تک بھی لانا کفر سمجھتے ہیں اور اس سے لرز جاتے ہیں کہ ان حضرات کے مسلک کو تنقید کی نگاہ سے دیکھیں۔ خواہ وہ تنقید خالص قرآن کی کسوٹی ہی سے کیوں نہ کی جاتی ہو۔ لیکن سلیم! یاد رکھو، جب تک ہم یہ مسلک (ATTITUDE) اختیار نہیں کریں گے کہ اپنے مروجہ عقائد اور تصورات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں اور ایسا کرنے میں کسی اور خیال کو اثر انداز نہ ہونے دیں، اس وقت تک ہم اس ضابطۂ زندگی (الدین القیم) کے قریب تک بھی نہیں آسکیں گے۔ جسے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا۔

باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ ان لوگوں سے بعض اوقات ایسی باتیں (کرامات) سرزد ہوتی ہیں جن کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ تو اس کے متعلق اس خط میں اس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں کہ ان باتوں کو دین سے کوئی علاقہ نہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک قوت ہے (جسے قوتِ خیال کہہ لو یا (WILL POWER) جسے اگر خاص طریقوں سے (DEVELOP) کر لیا جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جنہوں نے ایسا نہ کیا ہو۔ یہ کچھ ہر انسان کر سکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں ہندو سادھوؤں اور سنیاسیوں سے (جو علانیہ بت پرستی کرتے ہیں) ایسی "خارقِ عادات" باتیں سرزد ہوتی ہیں جو مسلمان پیروں سے بھی نہیں ہوتیں۔ اس باب میں تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میری عمر کا ایک بڑا حصہ انہی وادیوں میں گزرا ہے اور میں نے یہ سب کچھ خود کر کے دیکھا ہے۔ اس لئے میں اپنے ہاں کی خانقاہوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ سادھوؤں کی سمادھیوں تک بھی ہو آیا ہوں۔ وہاں یہی دیکھنے گیا تھا کہ اگر یہ "کرامات" دینِ اسلام کا معجزہ ہیں تو پھر مشرکین سے یہی کچھ کیسے سرزد ہو جاتا ہے! لہٰذا اس باب میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ —
قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

لیکن میں اس ضمن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس لئے کہ (تم تو شاید ضبط کر لو لیکن) اگر طاہرہ بیٹی نے سن پایا تو وہ سر ہو جائے گی کہ چچا ابا کچھ ہمیں بھی دکھائیے۔ زیادہ نہیں تو مائی جیتو کی بیٹی کا جن ہی نکال دیجئے! اسے کیا معلوم کہ یہ جن نکال لینے تو بہت آسان ہیں لیکن وہ جن جو پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ کو صدیوں سے چمٹے چلے آرہے ہیں ان کا نکالنا کس قدر مشکل ہے۔ اور ان جنات میں سے یہ جن تو بہت ہی بڑا خطرناک ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد الہام کا دروازہ کھلا ہے اور انسان خدا سے براہِ راست ہمکلام ہو سکتا ہے۔ یاد رکھو سلیم! رسول اللہؐ کے بعد، خدا سے "ہمکلام" ہونے کا ذریعہ صرف قرآن ہے اور قرآن کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا کوئی باطنی مفہوم نہیں۔

اب سمجھے تم کہ تصوف کا عقیدہ کس طرح ختمِ نبوت اور قرآن کی اکملیت کی عمارت کو بنیادوں تک سے گرا دیتا ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ اسلام کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں ہارے تھے انہوں نے اسے کس طرح مدرسوں اور خانقاہوں میں پہنچ کر پچھاڑا ہے۔

والسلام
پرویز

دسمبر ۱۹۵۴ء

علامہ اقبالؒ کا مقالہ

(اسلام اور تصوّف)

[تسلیم کے نام خط اوپر آچکا ہے۔ لیکن چونکہ بات سامنے آگئی ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر علامہ اقبالؒ کا ایک مقالہ بھی ساتھ ہی شائع کر دیا جائے۔ ان کا یہ مقالہ لکھنؤ کے اخبار (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور ہم نے اسے طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۴۸ء میں طبع کیا تھا۔ موقعہ کی مناسبت سے اسے دوبارہ پیش خدمت قارئین کیا جاتا ہے بالخصوص اس لئے کہ یہ دونوں نہایت اہم مقالات قارئین کے پاس ایک ہی پرچہ میں محفوظ ہو جائیں۔ اس قسم کے نوادرات حفاظت سے رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ طلوع اسلام]

"آج کل کا مسلمان یونانی و ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیے مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گردوپیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور توجہ اس نیلی، پیلی اور سرخ روشنی پر جما دی جائے، جسے "استغراق" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ "فنائیت" یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود ہی نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے روبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

دنیائے قدیم کی تاریخ ذہنی کے مطالعے سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گروہوں نے ہر دور میں اس خودساختہ تصوف اور فنائیت کے اوٹ میں پناہ لی ہے۔ جب روح حیات فنا ہو جاتی ہے اور زمان و مکان کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو داعیان انحطاط ایک مزعومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے معاشرے کی روحانی بے مائیگی اور جسمانی فرسودگی کو آخری مرحلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک لچا لینے والا نصب العین وضع کر لیتے ہیں انہیں کے فریب میں مبتلا ہو کر صحت مند اور قومی افراد بھی رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کا نظام ایک خاص نوعیت کا ہے جسے اوہام و وساوس کے ان ماتوں نے شدید

نقصان پہنچایا ہے۔ بحیثیت ایک معاشرے کے ہماری تخلیق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اجتماعی ترتیب و تنظیم میں نسل و زبان کے امتیازات پر خطِ نسخ کھینچ دیا جائے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظامِ شریعت کے تابع رکھیں جو اصلاً[1] مبنی بر وحی ہے۔ لیکن قدیم صوفیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ شریعت کی حیثیت تو محض ایک مظہر کی تھی۔ اور وہ خفیہ خفیہ اس کی تلقین بھی کرتے رہے۔ کہ یہ حقیقت کا ایک قشر اور ایک پردہ ہے۔ اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ شریعت سے الگ ہے۔ اکثر حالتوں میں شریعت کی پابندی قائم رکھی گئی تھی کہ اجتماعی لغزش سے بچے رہیں، اگرچہ اس کی حیثیت ایک پردے ہی کی رہی۔ اسلامی فکر و ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی فرد اس اعتراف میں تامل نہ ہوگا کہ شریعت سے اعراض کا رجحان اسی خود ساختہ تصوف کا براہِ راست نتیجہ ہے جو عجمی دل و دماغ کی پیداوار ہے، حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرے کو منظم و مرتبط رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یوں اسلامی جمہوریت رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام سے ہٹتی گئی اور اسے ایک نوع کی روحانی امرائیت کا غلام بنا دیا گیا۔ یہ امرائیت ایسے علم و قوت کی مدعی تھی جس کے دروازے عام مسلمانوں پر بند تھے۔ مسلمانانِ اندلس ارسطاطالیسی روحیت سے آگاہی کے باعث مغربی اور وسطی ایشیا کے ضعف انگیز اثراتِ فکر کے دائرے سے باہر تھے۔ وہ ایشیا کی مسلم قوموں کے مقابلے میں روحِ اسلام سے قریب تر تھے۔ آخر الذکر قوموں نے عربی اسلام کو عجمی تخیلات میں ڈھلنے دیا، یہاں تک کہ وہ اپنی حقیقی و اصلی حیثیت سے بالکل محروم ہو گیا۔ تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔

مغربی اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ دسویں صدی عیسوی کے بعد سے کیجئے، جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق و توثیق ملے گی۔ انحطاط کے سحر کی کیفیت یہی ہے کہ جن ہاتھوں سے ہم زہر کا پیالہ پیتے ہیں، انہی کو چومتے ہیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روزِ روشن میں افق پر جلوہ گر ہوا۔ ہمارے جمہوریت پرور پیغمبرِ اعظمؐ نے عاقل و دانشمند اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحاب نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا۔ حضورؐ کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جا سکے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریکی اور قنوطیت افزا تصوف کے لئے وجۂ جواز مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے، جنہوں نے صدیوں تک عالمِ انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔

پھر آئیے، دنیا کے حقائق کو خوشی خوشی قبول کیجئے۔ خدا اور اس کے رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے جلال و عظمت کی خاطر ان حقائق سے عہدہ برآ ہونے کی سعی و کوشش میں مصروف ہو جائیے۔ اس شخص کی بات پر کان نہ دھریئے جو کہتا ہے کہ اسلام میں کوئی مخفی اصول بھی ہے۔ جب نا آشنا اصحاؤں پر منکشف

[1] یعنی قرآن کریم جو تھا تو کلامِ خداوندی لیکن دنیا کو لسانِ نبوی کی وساطت سے ملا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

نہیں کیا جا سکتا۔ اسی پر چھوٹے مدعیوں کے اقتدار اور آپ کی غلامی کا انحصار ہے۔

دیکھئے، کس طرح رومی مسیحیت کی روح نے اپنے گرد و پیش مستحکم حصار تعمیر کر لیے تاکہ اس کی تاریک مملکتیں تاریخ نگاروں کے ممکن حملوں سے محفوظ رہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے تاریخ اسلام سے آپ کی ناواقفیت کی بنا پر فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو غلام بنا رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ کی روشنی کبھی نہ کبھی اس کی تعلیمات کے دھندلکے کو آپ کی ذہنی فضا سے زائل کر دے گی۔ لہٰذا وہ آپ کو سکھاتے ہیں کہ حسی ادراک، حجابِ اکبر ہے (العلم حجاب الاکبر)۔ حسی ادراک کے یہ دشمن آپ کے احساسِ حقائق کو کند کرتے ہیں اور علمِ تاریخ کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔

نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحانہ انداز کی اس توحید کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آ جاؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/75

سرخیلِ غدّاران

[پاکستان میں طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء کو شائع ہوا۔ اس وقت شیخ محمد عبداللہ، ہندوؤں کے ساتھ مل کر، خطۂ کشمیر کو پاکستان سے علیحدہ رکھنے کی سازش میں مصروف تھا۔ ہم نے اس اشاعت کے اولین صفحات میں عنوانِ بالا کے تحت حسبِ ذیل شذرہ شائع کیا۔ طلوعِ اسلام]

" انسان بھی عجیب مجموعۂ اضداد ہے۔

اس کی رفعتوں کی طرف نگاہ اٹھائیے تو آسمان کے فرشتے اس کے حضور سجدہ ریز نظر آئیں گے اور اس کی پستیوں کو دیکھئے تو شیاطین اخبث بھی اس سے پناہ مانگتے دکھائی دیں گے۔

اس کے ایمان کے مظاہروں کو سامنے لائیے تو وہ دہکتی ہوئی آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں تبسم کناں کود جائے گا۔ لیکن حق و صداقت پر ذرا سی آنچ نہ آنے دے گا اور اس کی منافقانہ کرتوتوں کو دیکھئے تو ایک ذرا سی ذاتی منفعت کی خاطر پوری کی پوری متاعِ دین و ملت بلا تامل و توقف بیچ ڈالے گا۔

آسمان کی آنکھ نے ان دشمنانِ انسانیت، غدارانِ ملت کے اس قسم کے بیع و شریٰ کے اکثر معاملات کو دیکھا

چاہِ کنعان کے کنارے، برادرانِ یوسفؑ کو دیکھا۔ یروشلم کی پہاڑیوں پر یہودا اسکریوطی کو دیکھا۔ بغداد کے ایوانوں میں ابن علقمی کو دیکھا، دہلی کے قلعہ میں مشہور نمک حرام نوبجی کو دیکھا۔ کہیں سرزمین بنگالہ میں جعفر لعین کو دیکھا اور کہیں خطۂ دکن میں صادق لئیم کو دیکھا۔ گاہ یورپ کے کلیساؤں میں، کلید بردارانِ کعبہ کو دیکھا۔ اور گاہ ہندوستان کے بتکدوں میں دعویدارانِ تولیتِ قبلہ کو دیکھا۔

اس نے باری باری ان غدارانِ ازلی کو دیکھا اور ان کی انسانیت سوز اور ایمان فروش "تجارت" کو ہر جگہ بھانپا لیکن جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے کشمیر کی وادیوں میں گزرا ہے اس کی مثل و نظیر اس نے شاید ہی کہیں پہلے اور دیکھا ہو۔ ایک کشتِ گندم پر فردوسِ ملت بیچنے والے ابنائے آدم تو اس کی آنکھوں نے بیشتر دیکھے تھے۔ لیکن یہ مردودِ ازلی ابلیس نے دندناتے ہوئے آواز لگایا کہ

میں ایک جَو پہ دونوں جہاں بیچتا ہوں

مجالسِ ملت فروشاں میں یہ اپنی طرز کا پہلا سودا گزرا ہے جس کی تجارت میں نہ شرم و حیا کا کچھ پاس ہے نہ ننگ و ناموس کا کچھ لحاظ۔ جسے نہ کسی انسان کے پنجۂ مکافات کا کوئی خوف ہے، نہ خدا کی بطشِ شدید کا ڈر۔ جس کی بے حیائی پر حیا خون کے آنسو رو رہی ہے اور جس کی بے غیرتی پر غیرت پانی پانی ہو رہی ہے۔ یہ وہ [illegible]

وہ جس ہے جس سے نہ خاکِ لحد اپنے آپ کو ملوث کرنے کے لئے آمادہ ہے نہ آتشِ جہنم اپنے آپ کو "ناپاک" کرنے کے لئے تیار۔ جسے نہ اس دنیا میں کوئی شریف انسان اپنے پاس پھٹکنے کی اجازت دے سکتا ہے نہ اس جہان میں اس کے لئے کوئی گوشۂ عافیت ہے۔

اے ہوا! گھٹے تند! اے دریائے خوں ۔ اے زمیں! اے آسمانِ نیلگوں!
اے نجوم! اے ماہ تاب! اے آفتاب! ۔ اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب!
اے بتانِ ابیض! اے مردانِ عرب! ۔ اے جہانے در بغل بے حرب و ضرب
ایں جہان بے ابتدا بے انتہا است ۔ بندۂ غدار را مولا کجا ست!

یہی ہے وہ عبد الطاغوت، عبد اللہ معکوس جس شر الدواب کے متعلق قرآن میں ہے کہ ان المنافقین ... ولن تجد لھم نصیرا (۱۴۵/۴)
یقیناً یہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے حصہ میں ہوں گے اور تو ان کا کوئی مددگار نہیں پائے گا۔

[۱۹۶۴ء میں یہ غدار ازلی ایک ناصح مشفق کے لباس میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی ایک تجویز لے کر وارد پاکستان ہوا۔ یہ تجویز تھی بھارت اور پاکستان میں کنفیڈریشن قائم کرنے کی۔ ہماری سادہ لوح اور زود فراموش قوم نے اس کا بڑا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن طلوعِ اسلام نے اپنی جولائی ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل لمعات سپردِ قلم کئے۔

"اپنی رہائی کے بعد، شیخ محمد عبد اللہ نے مسئلہ کشمیر کے کسی حل کی تلاش میں پاکستان اور بھارت کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی سعی و کاوش کی ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ صاحب موصوف کچھ تجاویز لے کر پاکستان آئے اور یہاں ان کا پرجوش خیر مقدم بھی کیا گیا۔ ان تجاویز میں ایک ایسی تجویز بھی شامل تھی جس کے نتائج و عواقب سے آنکھیں بند کر لینا ممکن نہیں۔ اس تجویز کا مقصد یہ تھا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے طور پر پاکستان اور بھارت میں ایک فیڈریشن یا کانفیڈریشن کی صورت پیدا کی جائے۔ شیخ محمد عبد اللہ سالہا سال سے ایک نیشنلسٹ مسلمان کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں اور اسی حیثیت سے انہوں نے سالوں تک پنڈت نہرو آنجہانی کے ساتھ مل کر کام بھی کیا ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ ایک نیشنلسٹ ذہن اس تجویز کے دور رس نتائج اور اثرات کو پوری طرح سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ لیکن جہاں تک ملتِ پاکستان کا تعلق ہے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے ایسی تجاویز کے تخریبی انجام سے پوری طرح آگاہ کر دیا جائے جو بظاہر صلح و اتحاد اور امن و آشتی کی شکر میں لپٹی ہوئی میٹھی گولیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان کے اندر وہ تریاق نما رنگ کا زہر اور وہ سلو پائزن (Slow Poison) موجود ہے جو خود مملکتِ پاکستان کی صحت سلامتی بلکہ اس کے وجود تک کے لئے جان کا لاگو بن جائے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مملکتِ پاکستان کا وجود وقت اور حالات کے کسی سیاسی تقاضے کا رہینِ منت ہے۔ کہ جونہی ایک نئی ضرورت اور نیا تقاضا سامنے آیا اس کے مطابق اس مملکت کی ضرورت و اہمیت بھی بدل گئی؟

کیا پاکستان کے حصول کی جنگ محض ایک سیاسی کھیل تھا جو ہماری قوم نے سالہاسال تک کامیابی سے کھیلا اور اب وہ اس کے خلاف ایک نیا کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے ؟ کیا تشکیل پاکستان کے عواقب میں آگ اور خون کے جو سمندر بہہ گئے ۔ عصمت و ناموس کے جو بیبہا خزانے لٹائے گئے چپے چپے پر لاشوں کی جو سیجیں بچھائی گئیں وہ کسی وقتی اور ہنگامی مفاد کو پورا کرنے کے لئے تھیں اور اب کسی نئے مفاد کی بجا آوری کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا جائے ؟ کیا اس برصغیر کی سرزمین میں نظریاتی اساس پر تحریک پاکستان کی جو عظیم الشان جنگ لڑی گئی وہ اس لئے تھی کہ جب بھی کوئی نیا ہنگامی تقاضا ابھر کر سامنے آئے ہم بساط سیاست پر اپنی مملکت کی آزادی اور سلامتی تک کی بازی لگا دیں !

ہم نہیں جانتے کہ شیخ محمد عبداللہ یا ان کے ہم خیال حضرات کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب موجود ہے یا نہیں ۔ لیکن جہاں تک ہمارا اور ہماری ملت کا تعلق ہے ہم ایک بار پھر دنیا کے سامنے ببانگ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے نام پر اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کا جو انقلاب آفریں معرکہ ہم نے سرانجام دیا تھا وہ حالات کے کسی رسمی تقاضے کا پابند تعلقا" نہیں تھا ۔ یہ وہ آواز تھی جو قلب ملت کی گہرائیوں سے ابھری اور نفیر انقلاب بن کر اس برصغیر کی فضاؤں میں گونجی تھی ۔ یہ صدیوں کے بعد اس تاریخی حقیقت کا غیر مبہم اور دوٹوک اعلان تھا کہ اس برصغیر کے مسلمان یہاں کے ہندوؤں سے ایک الگ اور جداگانہ قوم ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ایک قوم اور ملت کی اساس وطن رنگ یا نسل کا اشتراک نہیں بلکہ یہ بنائے اشتراک اس تصور حیات (IDEOLOGY) پر ایمان ہے جو خدا کا دین ہر مسلمان کو عطا کرتا ہے ۔

ہم نے اپنے لئے اگر ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا تھا تو اس لئے کہ خدا کے جس دین پر ایمان رکھتے ہوئے ہم ہندوؤں سے الگ ملت قرار پاتے ہیں وہ ایک نظام مملکت کی حیثیت سے خدا کی زمین پر اپنا تمکن اور غلبہ و استحکام چاہتا ہے ۔ خدا کے اس دین پر ایمان لانے کا مقصود و منتہیٰ یہی ہے کہ اس کے عطا فرمودہ اصول و اقدار کے مطابق خدا کی زمین پر ایک معاشرہ متشکل ہو ۔ اس معاشرہ میں انسانوں کے خودساختہ قوانین کی بجائے خالص قانون خداوندی کی کارفرمائی عمل میں آئے ۔ ہر انسان ، شرف انسانیت سے مالامال ہو اور جس آزادی کی "تلاش میں انسان صدیوں سے مارا مارا پھر رہا ہے اس کا شجر طیب پھلے پھولے اور برگ و بار لائے ۔ الغرض ہندوؤں سے الگ مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا قیام نہ تو وقت اور حالات کا کوئی ہنگامی تقاضا تھا ۔ اور نہ یہ ہندوؤں سے کوئی سیاسی سودے بازی تھی ۔ یہ ہمارے دین و ایمان کے بنیادی تقاضوں کی پکار تھی جسے لبیک کہتے ہوئے ہم نے انگریز اور ہندو دونوں سے جنگ مول لی ۔ دونوں کی منظم قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ۔ ہر بڑے سے بڑے خطرے سے مردانہ وار نبرد آزما ہوئے اور ہر بڑے سے بڑے طوفان کا رخ موڑ دیا ۔

تاریخ کا جائزہ لیجئے تو صاف دکھائی دے گا کہ اس جنگ کا آغاز سرسید علیہ الرحمۃ کے دور میں ہی ہو چکا تھا ۔ اسی زمانے میں ہی سرسید رح کی عقابی نگاہیں یہ اندازہ لگا چکی تھیں کہ اپنے بنیادی

تفاوتِ تصورات کے اعتبار سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نفسیات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھیں کہ ان دونوں کا مل کر چلنا ممکن نہیں تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور یہاں کے نظامِ حکومت پر انگریز حکمرانوں کی گرفت کمزور پڑتی گئی ہندوؤں کے قلوب و اذہان پر سے نقاب اٹھتے چلے گئے اور یہ حقیقت بیش از بیش نکھرتی اور ابھرتی چلی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی منزلِ مقصود ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہے۔ اور یہ قطعاً ممکن نہیں کہ کسی نظامِ مملکت میں وہ ایک دوسرے کے شریک کار بن سکیں۔ پاکستان کا قیام اسی ناقابلِ انکار حقیقت کا جیتا جاگتا نشان تھا۔

اب جبکہ بھارت اور پاکستان کے نام پر ہر دو قومیں اپنی الگ مملکتیں تشکیل کر چکی ہیں۔ ہر دو مملکتوں میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف دو جداگانہ نظام نشو و ارتقاء حاصل کر رہے ہیں۔ سترہ سال کے تلخ واقعات اور مربوط حقائق نے یہ مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے کہ تقسیم ہند کا فیصلہ کسی ہنگامی تقاضے کی پیداوار قطعاً نہیں تھا بلکہ یہ اس برصغیر کی اٹل تقدیر تھی جسے زمانے کا بڑے سے بڑا انقلاب اب نہ بدل سکتا ہے اور نہ اس میں کسی ترمیم کی کوئی گنجائش پیدا کر سکتا ہے۔ تو ایسی صورتِ حال میں یہ تصور کرنا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے تقدیر کے اٹل فیصلے بدل دیئے جائیں۔ چالیس پچاس لاکھ انسانوں کے مستقبل کی خاطر کوئی متفق علیہ بنیاد تلاش کرنے کے لئے وہ عمارت زیر و زبر کر دی جائے جو خالص دین کی بنیادوں پر اٹھی تھی اور قرآنی تصورِ حیات کے محکم سہاروں سے قائم کی گئی تھی۔ تو پھر اس انوکھی تجویز پر کس کے ذہنی افلاس کا ماتم کریں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسئلہ کشمیر کا قطعی اور سر بسر منصفانہ حل ساری دنیا کے سامنے موجود ہے۔ دونوں ملک اس حل کو بطیب خاطر قبول کر چکے ہیں۔ یو۔ این۔ او اس حل پر کئی سال قبل سے مہرِ توثیق ثبت کر چکی ہے۔ خود کشمیر کے عوام اور ان کی نمائندہ جماعتیں اس حل کے سوا اور کوئی حل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور وہ حل ہے۔

اہلِ کشمیر کا حق خود ارادیت اور اس کی بنیاد پر استصوابِ رائے۔

جب مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل کے لئے متفق علیہ اور طے شدہ بنیاد موجود ہے تو اس کی موجودگی میں دونوں ملکوں کے درمیان کنفیڈریشن کے قیام کا آخر مقصد کیا ہے؟

اگر بھارت اپنی تازہ مصلحتوں یا ہٹ دھرمی کی بنا پر آج استصوابِ رائے کے فیصلے سے روگردانی اختیار کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ ایسے نئے اور متبادل حل تلاش کئے جائیں جو پاکستان کی بنیاد کو ہی اکھیڑ دیں۔ اگر شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی یہ طاقت نہیں رکھتے کہ بھارت کو طے شدہ فیصلوں پر عمل درآمد کے لئے مجبور کر سکیں تو ان کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ وہ میدان سے ہٹ جائیں۔ کشمیری عوام کی جس قوت نے بھارتی حکمرانوں کو شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں کے لئے جیل کے دروازے کھولنے پر مجبور کر دیا تھا وہی قوت طے شدہ فیصلوں پر عمل درآمد کا امکان بھی پیدا کر لے گی۔

ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ استصوابِ رائے کے اس طے شدہ واضح حل کی موجودگی میں شیخ محمد عبداللہ

صاحب نے مسئلہ کشمیر کے مزید نئے نئے حل تلاش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی ہے اور اس شدتِ احساس میں وہ کیوں ایسی تجاویز دریافت کرنے پر اتر آئے ہیں جو حصول پاکستان کی اساس اور اس کی وجہ جواز تک کو سبوتاژ کر کے رکھ دیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان اس وقت تک کئی تنازعات ابھر چکے ہیں اور آئندہ بھی کئی ایسے مسائل سامنے آتے رہیں گے لیکن ان کا حل تلاش کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے لئے منفی اور تخریبی اندازِ فکر اختیار کیا جائے اور دونوں مملکتوں میں دوستی کی فضا پیدا کرنے کے لئے ان بنیادوں کو ہی زیروزبر کر دیا جائے جن سے پاکستان کا وجود اور سلامتی قائم رہے۔ خود مملکتِ پاکستان اس لئے وجود میں نہیں آئی تھی کہ جونہی اس برصغیر میں کوئی چھوٹا بڑا مسئلہ ابھرے اس کے حل کے لئے سب سے پہلے اس نوزائیدہ مملکت کی بنیادوں پر ہی ضرب کاری لگائی جائے۔ ہم پورے خلوص اور دیانتداری سے یہ چاہتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر جلد از جلد حل ہو — اور اس کا دوٹوک حل استصواب رائے کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ لیکن اگر کسی کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تو اس کے لئے ہم یہ سوچنے تک کے روادار نہیں کہ دونوں مملکتوں میں کنفیڈریشن کی صورت کیونکر پیدا کی جائے۔ یہ طرزِ فکر نہ صرف مملکتِ پاکستان سے غداری کے مترادف ہے بلکہ ہمارے دین وایمان کے ان تقاضوں کے منافی بھی جن کی بجاآوری کے لئے ہم نے اپنی اس جداگانہ مملکت کے حصول وقیام کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اس کے لئے سالہاسال تک جان توڑ جدوجہد کی اور بالآخر ربّ ذوالمنن کے فضل وکرم سے وہ مملکت ایک جیتی جاگتی درخشندہ حقیقت بن کر نقشۂ عالم میں ابھر آئی۔ اب یہ مملکت اپنی آزادی اور استقلال کی شایانِ شان روایات کے ساتھ ہمیشہ زندہ و سلامت رہے گی۔ اور اسے وقت اور حالات کے کسی بڑے سے بڑے تقاضے قربان کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

جو مملکتیں محض سیاسی مصالح کی بنا پر وجود میں آئی ہوں ان کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا کہ جب سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہو تو وہ دوسری مملکتوں کے ساتھ فیڈریشن یا کنفیڈریشن قائم کریں حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو کسی دوسری مملکت میں مدغم ہی کر دیں۔ سیاسی مملکتیں اس کے سوا کیا ہیں کہ صفحۂ ارض کے نقشے پر چند لکیریں کھینچ دی گئی ہیں۔ جب دو مملکتوں کے درمیان اس خطِ امتیاز کو مٹا دیا جائے تو وہ مملکتیں ایک ہو سکتی ہیں۔ لیکن جس مملکت کا وجود اس حقیقت کا اعلان ہو کہ کفر اور اسلام، شرک اور توحید، باطل اور حق میں ادغام تو ایک طرف کسی قسم کا اشتراک نہیں ہو سکتا۔ وہ مملکت اپنے آپ کو کسی ایسی دوسری مملکت کے دامن کے ساتھ کیسے منسلک کر سکتی ہے جس سے وہ دین کی بنیادوں پر الگ ہوئی تھی۔ آپ کانفیڈریشن کو تسلیم کیجئے تو اس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہوں گے کہ مملکت پاکستان سیاسی وجوہ کی بنا پر وجود میں لائی گئی تھی اور جب ہم اس حقیقت کا اعتراف کر لیں تو بھارت سے الگ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز بھی ختم ہو جاتی ہے۔ کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لئے اب کنفیڈریشن کو تسلیم کر لیجئے تو کل کو بھارت کی اقلیتوں پر مظالم کے مسئلے کے حل کے لئے دونوں مملکتوں کے بار دگر ادغام کے لئے بھی تیار رہیئے ہمیں امید ہے کہ شیخ محمد عبداللہ صاحب بھی دوبارہ اس قسم کی تجویز سامنے لانے سے پہلے اسے

اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ اس پر ملت اسلامیہ پاکستانیہ کا ردِ عمل کیا ہوگا اور جو لوگ پاکستان میں رہتے ہوئے اس قسم کی تجاویز کو درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں انہیں بھی معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اس سے وہ اس جیبھ کا اظہار کر رہے ہیں جو پاکستان کے وجود کے تصور سے انہیں چین کی نیند سونے نہیں دیتی۔ جو شخص پاکستان کے وجود کو دین کا تقاضا سمجھتا ہے وہ اس قسم کے تصور کو بھی کفر اور شرک سے کم نہیں سمجھتا۔

یہ پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ ممتاز کشمیری راہنما خواجہ مبارک شاہ کا ایک بیان (پاک بھارت کنفیڈریشن سے متعلق) اخبارات میں شہ سرخیوں سے شائع ہوا۔ خواجہ مبارک شاہ، شیخ محمد عبداللہ صاحب کے رفقائے خاص میں سے ہیں۔ وہ شیخ صاحب کے ساتھ ہی پاکستان کے دورے پر آئے تھے لیکن ان کے ساتھ واپس جانے کی بجائے ایک ماہ تک پاکستان میں گھومتے پھرتے رہے۔ ۲۴ جون کی دوپہر کو جب وہ لاہور کے ہوائی اڈے سے نئی دہلی روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے پاک بھارت کنفیڈریشن سے متعلق اخباری نمائندوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ کہا وہ ملت پاکستان کے ہر فرد کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے۔ ان کا نقطۂ نظر ان کے اپنے الفاظ میں سنئے:۔

> انہوں نے کہا کہ پاکستان ایک جدید لادینی ریاست کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔
> اور چونکہ بھارت بھی ایک لادینی مملکت ہے اس لئے دونوں کو ایک دوسرے
> کے قریب لانے اور باہمی یگانگت پیدا کرنے کے لئے یہ ایک بنیاد موجود ہے
> (روزنامہ "مشرق" لاہور۔ ۲۵ جون ۱۹۶۴ء)

اس بیان کا ایک ایک لفظ ان اندیشہ ہائے دور دراز کی توثیق کر رہا ہے جن کا اظہار ہم نے سطور بالا میں کیا ہے۔ اور یہ حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے کہ پاک بھارت دوستی کے نعرے بلند کر کے یہ حضرات پاکستان کے مستقبل کو کس صورتِ حال کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ انہوں نے تحریک پاکستان اور اس کے بعد قیامِ پاکستان کے ابتدائی ایام میں ہماری مملکتِ عزیز کے خلاف کس قسم کے کردار کا ثبوت دیا تھا اور اب جو دیکھا کہ (حسبِ سابق) پاکستان کی کھلم کھلا مخالفت کر کے وہ کشمیری عوام کے جہادِ حریت میں قیادت کا منصب حاصل نہیں کر سکتے تو انہوں نے یہ روپ بدل کر آگے بڑھے ہیں۔ اور مقصد پیشِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ صلح و اتحاد اور امن و آشتی کی اوٹ میں پاکستان پر وہ ضرب کاری لگائی جائے جو اس کی اساس کو زیر و زبر کر کے رکھ دے۔"

اور اب یہ بھیڑیا اپنی گوسفندی کھال کو اتار کر بے نقاب سامنے آگیا ہے۔ یہ کوئی نیا شیخ عبداللہ نہیں وہی ۴۸-۱۹۴۷ء والا غدار ازلی ہے۔ علاج اس کا وہی تھا جو اس وقت سرحد کے مجاہدین نے سوچا تھا۔ لیکن جن کے ہاتھ غیروں نے نہیں، خود اپنوں ہی نے قطع کرائے تھے۔

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد!

اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس وقت جہادِ کشمیر کو ناجائز قرار دینے والے اب یوم کشمیر منا رہے ہیں۔

قتل کر کے مجھے اب سوگ منانے بیٹھا!

شاہد عادل
میانوالی

روحانی بزرگ بننے کا آسان نسخہ

موجودہ سیاسی صورت حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک روحانی بزرگ نے نہایت عجیب ارشاد فرمایا۔ فرمانے لگے کہ ہمارے سیاستدانوں کو ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لئے گولی کا استعمال یا دھمکی نہیں دینی چاہیئے۔ ہمارے پاس تشریف لائیں تو ہم انہیں ایسے مؤثر تعویذ لکھ دیں کہ ان کے مخالف یا تو راہ راست پر آجائیں یا خود بخود ختم ہو جائیں۔ ہمارے پاس ایسے تعویذ بھی ہیں کہ دفعہ ۱۴۴ لگانے کی ضرورت بھی نہیں، بلکہ ناپسندیدہ شخصیت خود بخود شہر سے نکل جائے گی۔ بندہ نے عرض کیا کہ یہ سیاستدان تو شاید اس دور دراز علاقے تک نہ پہنچ سکیں اگر آپ واقعی ان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو آپ یہ تعویذ مجھے عنایت فرمائیں، بندہ ان تک پہنچا دے گا۔ روحانی بزرگ اس کار خیر کے لئے راضی ہو گئے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے کوئی ایک درجن عمل و تعویذ عنایت فرمائے جنہیں ہم ضرورتمند حضرات کے فائدے کے لئے من و عن نقل کرتے ہیں۔

مخالف کو کند ذہن کرنا

اپنے مخالفوں کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ اٹھانا ہوگا کہ انہیں مندرجہ ذیل عمل کے ذریعے کند ذہن کر دیا جائے۔

جمعرات کا روزہ رکھو اور نماز عشاء پڑھنے کے بعد پارہ لا یحب اللہ کے تیرھویں رکوع کی یہ آیات قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ ..... سواء السبیل تک کسی وقفے بغیر ایک مشت خاک پر تین بار پڑھ کر اس مخالف کے گھر میں وہ مٹی پھینک دو۔ اور پھر قدرت کا تماشہ دیکھو کہ وہ کس طرح کند ذہن ہو جاتا ہے۔

مخالف سے بحث میں غلبہ

اس کے بعد اگر مخالف سے بحث کا موقع آئے تو پھر اس سے بحث شروع کرنے سے پہلے اتوار کے دن روزہ رکھ کر ایک چیتھڑے کے ٹکڑے پر سورۃ النساء کی آیت يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ سے صراطاً مستقیماً تک لکھ کر باندھ لے۔ مخالف پر بحث میں غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

ظالم حاکم کی معزولی

اب اگر آپ کا مخالف حاکم ہے اور آپ کی اس کے سامنے کچھ نہیں چلتی۔ تو گھبرانے کی بات نہیں۔ ایک بڑی سی نئی رکابی لیں۔ اس پر ایسی نحس اندھیری رات میں جبکہ آسمان پر گرج چمک ہو، تو اسی آسمانی چمک کی روشنی میں

سورۃ الرعد لکھیے۔ پھر اسے بارش کے پانی سے دھو کر ویسی ہی اندھیری رات کو اس ظالم حاکم کے دروازے پر چھڑک دیجیے۔ اسی روز حکومت سے معزول ہو جائے گا۔

دشمن کو نقصان پہنچانا

اگر آپ اپنے مخالف کو ختم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس سے رعایت برتتے ہوئے اسے صرف نقصان پہنچانے پر اکتفا کرتے ہیں تو اپنے مخالف کے بدن کا ایک کپڑا لے کر اس پر اس کا اور اس کی ماں کا نام سات مرتبہ لکھیں اور اس کے اردگرد ایک دائرہ کھینچ دیں۔ اور اس میں آیات الحرر (ی) لکھ دیں پھر اس پر ایک دائرہ کھینچ دیں۔ اس طرح تین دائرے بنائے جائیں پھر اس کپڑے کو لپیٹ کر مٹی کے کسی کورے برتن میں رکھ کر ہفتے کے روز اس مخالف کے گھر میں ایسی جگہ دفن کر دیں کہ جہاں کسی کا پاؤں نہ پڑتا ہو۔ اور پھر تماشا دیکھیں!

دشمن اور مخالف کو ویران کرنا

اس مقصد کے لئے ہفتے کے دن ایک کچی ٹھیکری تیار کرو اور کسی پرانے قبرستان کی تھوڑی سی مٹی ہفتے کے دن لے لو اور تھوڑی سی مٹی کسی ویران گھر کی لے لو اور تھوڑی سی مٹی کسی ایسے خالی گھر کی لو جس کے رہنے والے سب مر گئے ہوں۔ پھر ٹھیکری پر آیت یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ سے کٰفِرِیْن تک لکھو۔ پھر اس ٹھیکری کو باریک پیس کر اوپر والی اکٹھی کی ہوئی مٹیوں کے ساتھ ملا کر اپنے مخالف دشمن کے گھر میں ہفتے کے روز صبح سویرے بکھیر دو۔ انشاء اللہ ویران ہو جائے گا۔

مخالف کو شہر سے نکالنا

اگر آپ اپنے مخالف کو شہر سے نکالنا چاہتے ہیں یا حکومت کو کوئی ایسی ضرورت درپیش ہے تو دفعہ ۱۴۴ لگانے کی مطلق ضرورت نہیں مندرجہ ذیل عمل کیجئے انشاء اللہ مخالف خود بخود شہر سے باہر نکل جائے گا۔

سات عدد سرخ کھونگچیاں لو۔ ان پر سات دن تک روزانہ ایک ایک دفعہ آیت وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ پڑھیے اور پھر ہر روز ایک ایک کھونگچی اس شہر کے کنویں میں ڈالتے جائیں۔ مخالف فوراً شہر سے نکل جائے گا۔

مخالف کو ہلاک کرنا

اگر اوپر والی عملیات سے آپ کی تسلی نہیں ہوتی اور آپ ضرور ہی اپنے مخالف کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو پھر کسی مہینہ قمری کی اٹھائیس تاریخ کو روزہ رکھو اور اگر وہ اتفاق سے ہفتے کا دن ہو تو پھر سونے پر سہاگہ۔ پھر روزہ جو کی روٹی کے ساتھ افطار کرو۔ پھر آدھی رات کے وقت اٹھ کر جنگل میں جا کر کندر اور سندرس کی دھونی سلگا کر وہ آیات یعنی وَالَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ سے وَبِئْسَ الْمِھَادُ تک اور وَالَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ سے سُوْءُ الدَّار تک سات مرتبہ پڑھو اور اپنے مخالف کی ہلاکت کی بددعا کرو۔ مخالف ختم ہو جائے گا۔

قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ روحانی بزرگی کتنا زبردست لیکن آسان کام ہے۔ کہ گھر بیٹھے ملک کے سب سے بڑے حکمران کو معزول کروا دو اور جسے چاہو شہر سے نکال دو۔ جسے چاہو ویران کر دو۔ اور لطف کی بات یہ۔ کہ

یہ ایک ایسا پیشہ ہے جس کے لئے نہ کسی علم کی ضرورت ہے اور نہ ہی سرمایہ کی۔ بس تھوڑی سی ریاضت درکار ہے۔ اس ریاضت کی تفصیل تو ہم بعد میں عرض کریں گے۔ اس وقت ہم چند مزید عمل اور تعویذ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں کہ شاید ان میں کوئی ایسا بیکار بھی ہو جس کو اس سہارے کی ضرورت ہو۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اگرچہ ان روحانی بزرگوں کے پاس ہر طبقہ خیال کے لوگ جاتے ہیں لیکن ان میں عورتوں کی اکثریت ہوتی ہے اور ان کے زیادہ تر مسائل اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انہیں نرینہ اولاد ملے۔ یا ان کا حمل ضائع ہونے سے بچ جائے۔ یا میاں بیوی یا دوسرے محبت کرنے والے لوگوں میں تفریق و عداوت پیدا ہو۔

اولاد نرینہ

حمل ٹھہر جانے کے شروع مہینے میں اگر عورت کی داہنی پسلی پر سورت الاعلیٰ لکھ دیں تو اولاد نرینہ پیدا ہوگی۔ دوسرا عمل یہ ہے کہ اس عورت کے پیٹ پر گول لکیر کھینچے اور ستر بار انگلی پھیرنے کے ساتھ یا متین پڑھے۔ انشاء اللہ لڑکا پیدا ہوگا۔

یہ عمل ذرا خطرناک سا ہے۔ کیونکہ عورت کی پسلی پر لکھنے یا دائرہ لگانے میں اگر کوئی "غلطی" ہو جائے تو پھر جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ چند سال پہلے ہمارے علاقے میں ایک روحانی بزرگ نے کسی عورت کے پیٹ پر کچھ ضرورت سے زائد دائرے بنانے شروع کئے تو بیچارے کو گولی کا نشانہ بننا پڑا اور وہ عورت جو نرینہ اولاد لینے آئی تھی اپنے خاوند سے بھی محروم ہو گئی۔

حمل ٹھہرانا

جس عورت کا حمل نہ ٹھہرتا ہو، تو میاں بیوی دونوں جمعہ کے روز روزہ رکھیں۔ اور شکر، بادام اور روغن سے افطار کریں اور پانی بالکل نہ پئیں۔ اور پارہ الم اقل ثلث کی آیات اِنْ خِفْتُمْ الخ سے مُبَیِّنَۃً حتیٰ تک شیشے کے جام پر ایسے شہد سے لکھیں جسے آگ نہ پہنچی ہو۔ پھر اس تحریر کو میٹھے پانی سے دھو کر دو سو چوبیس دانے سفید چنے اس پانی میں بھگو دیں ان میں سے ہر دانہ پر یہ آیات پڑھیں اور پھر ان دونوں کو یعنی پانی اور چنوں کو ہنڈیا میں ڈال کر خوب پکائیں۔ پھر عشاء کی نماز پڑھ کر اس ہنڈیا پر سورت مریم پڑھی جائے۔ جب سفید چنے خوب پک جائیں تو پانی نکال لیا جائے اور پھر اس پانی میں تھوڑا سا انگوروں کا پانی ملا کر آدھا آدھا دونوں میاں بیوی پئیں اور تھوڑی دیر سو رہیں اور پھر اٹھ کر مباشرت کریں تو اسی روز حمل ٹھہر جائے گا۔

تفریق بین الناس

عورتوں کا دوسرا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ فلاں جوڑے یا فلاں فلاں کے درمیان ناچاقی ہو جائے۔ روحانی بزرگ چونکہ صنفِ نازک کا دل نہیں توڑنا چاہتے اس لئے وہ ان کو مندرجہ ذیل تعویذ دیتے ہیں۔

مجوزہ بیتر پر آیت والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ۔ تک لکھ کر اس کے نیچے یہ نقش بنا دیا جاتا ہے۔

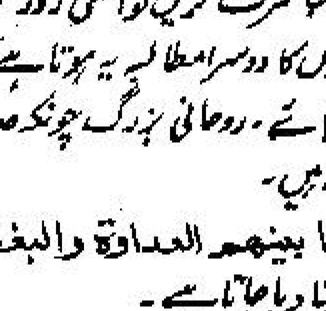

پھر اس نقش کے نیچے یہ عبارت لکھی جاتی ہے کہ فلاں فلاں کے درمیان تفریق واقع ہووے۔ فلاں کی جگہ دونوں کے نام لکھے جائیں اور پھر اس تعویذ کو دو پرانی قبروں کے درمیان دفن کر دیوے۔ اس سے بستے بستے گھر اجڑ جائیں گے۔

کسی پارٹی میں پھوٹ ڈالنا

یہ تو دو افراد کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا تعویذ تھا لیکن اگر کسی سیاسی پارٹی یا جماعت کے درمیان پھوٹ ڈالنی ہو تو پھر دوسرا عمل کرنا ہوگا اور وہ یوں کہ اس پارٹی یا جماعت کے سب سے بڑی عمر کے شخص اور سب سے چھوٹی عمر کے شخص کے تھوڑے تھوڑے بال لے کر ان کو آگ میں خاکستر کر لیا جائے۔ پھر کسی بڑے پاک برتن میں آیت "وقالت الیھود ید اللہ مغلولۃ" سے "لا یحب المفسدین" تک لکھے۔ پھر اسے حرمل کی بوٹی کے پتوں کے عرق سے دھو کر وہ پانی اور بالوں کی راکھ اس پارٹی یا جماعت کے اجتماع کی جگہ پر رکھ دے۔ انشاء اللہ ساری جماعت تتر بتر ہو جائے گی۔

مردانہ ضروریات

مرد حضرات یہ نہ سمجھیں کہ ان کے لئے کوئی تعویذ نہیں دیا جا رہا۔ اگرچہ مردوں کی خواہشات اور ضروریات کثیر ہوتی ہیں لیکن ایک روحانی بزرگ کے بقول ان میں سے زیادہ تر قوت مردمی کی بحالی، یہاں تک کہ امساک کے لئے تعویذ طلب کرتے ہیں اور چونکہ روحانی بزرگ کسی کو مایوس نہیں کرتے اس لئے وہ اپنی مقررہ فیس یعنی پانچ روپے وصول کر کے مندرجہ ذیل تعویذ عنایت کر دیتے ہیں:-

قوت مردمی کی بحالی کے لئے دو انڈے جوش دے کر ان کے چھلکے اتار کر ایک انڈے پر آیت والسماء بنینٰھا بایید وانا لموسعون۔ لکھ کر مرد کو کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اور دوسرے انڈے پر آیت والارض فرشنٰھا فنعم الماھدون۔ لکھ کر عورت کو کھانے کے لئے دیا جاتا ہے اور پھر مطلب حاصل ہو جاتا ہے۔

عضو تناسل کے ڈھیلے پن کو ختم کرنے کے لئے تین روز مسلسل روزہ رکھا جائے۔ پھر نصف شب کے وقت اٹھ کر اپنی داہنی ہتھیلی پر تانبے کے قلم سے گلاب و زعفران سے ابجد، ہوز الی الاخرہ۔ اور وقیل یا ارض ابلعی ماءک الی آخرہ لکھ کر بائیں ران میں باندھ دیں تو قوت امساک حاصل ہو جائے۔

جیسا کہ راقم نے شروع میں عرض کیا تھا یہ ایک ایسا پیشہ ہے کہ نہ تو اس کے لئے کسی سرمایہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی علم کی۔ بس تھوڑی سی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ وہ ریاضت یہ ہے کہ اس پیشے کو اختیار کرنے سے پہلے تین چار مہینے تک کسی مسجد کے حجرے یا مقبرے پر خاموشی سے بیٹھنا ہوگا تاکہ ضعیف الاعتقاد لوگوں میں کشش پیدا ہو جائے۔ جب کچھ لوگ آنا شروع ہو جائیں تو پھر ان کی موجودگی میں ایسی بہکی بہکی باتیں کریں۔ گویا آپ جنوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ بس اس کے بعد عملیات کا کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ قارئین نے محسوس کیا ہوگا۔ یہ سب خرافات قرآنی تعلیمات کے یکسر خلاف اور خدا کی

اس کتاب عظیم کے ساتھ مذاق ہیں۔ اگر یہ کاروبار جہلا تک ہی محدود ہوتا تو اس کا نوٹس لینے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس میں اچھے پڑھے لکھے لوگ پھنس جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ راقم نے ملازمت کے امیدواروں کو ان روحانی پیروں کی خدمات حاصل کرتے دیکھا ہے۔ دراصل یہ بھی مجبور ہیں۔ ہمارے دینی علوم کے بڑے بڑے مراکز اس کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً اس وقت میرے سامنے برِصغیر کے سب سے بڑے دینی مرکز دیوبند کے ترجمان ماہنامہ "تذکرہ" کا فروری ۱۹۷۵ء کا شمارہ کھلا پڑا ہے۔ اس کے عنوان "معارف وحقائق" کے تحت عملیات کی یوں ترغیب دی گئی ہے:۔

"ایک مرتبہ ایک شخص کا مقدمہ سہارنپور میں ڈپٹی ظہیر عالم کی عدالت میں پیش ہوا۔ وہ شخص عابد حسین صاحب دیوبندیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مقدمہ میں کامیابی کا تعویذ مانگا۔ حاجی صاحب نے دے دیا اور فرمایا کہ جب عدالت میں جانا تو اس کو اپنی پگڑی میں رکھ لینا۔ وہ شخص جب عدالت میں اجلاس پر پہنچا اور ڈپٹی نے کچھ سوال کیا تو اس کو یاد آیا کہ تعویذ بھول گیا ہوں۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب سے کہا کہ ابھی ٹھہر جاؤ، میں دیوبند والے حاجی صاحب کا تعویذ لایا ہوں، اس کو لے آؤں تب پوچھنا۔ ڈپٹی صاحب یہ سن کر ہنسے کیونکہ وہ عملیات پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔

جب وہ شخص تعویذ لے آیا۔ تب کہا، پوچھو کیا پوچھ رہے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے کچھ سوال کئے اور پھر اپنے خیال میں قصداً اس مقدمہ کو بگاڑ دیا۔ مگر جب فیصلہ لکھ کر پڑھنے بیٹھے تو وہ موافق تھا۔ یہ دیکھ کر ڈپٹی صاحب پشیمان ہوئے۔ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ عمل کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب وہ معمول پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کا دماغ صحیح نہیں رہتا۔ اور جب دماغ صحیح نہیں رہتا تو کام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں"

جنتر منتر، گنڈا، تعویذ، ورد، وظائف وغیرہ انسان کے دورِ جہالت سے اس کے ساتھ لگے چلے آرہے ہیں۔ جوں جوں اور جہاں جہاں علم کی روشنی پھیلتی گئی، یہ تاریکی کم ہوتی اور گھٹتی گئی۔ انسانوں کا خودساختہ مذہب چونکہ علم وعقل کا دشمن ہوتا ہے، اس لئے مذہب پرست دنیا میں یہ سب اوہام پرستیاں بڑا مقدس مقام حاصل کر لیتی ہیں۔ نزولِ قرآن سے پہلے، مضافاتِ عرب میں، یہودی اور عیسائی احبار و رہبان کے ہاں یہ روش عام تھی۔ عربوں کے ہاں یہی لوگ جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے۔ قاضی ابوبکر جصاص نے اپنی تفسیر "احکام القرآن" میں سورہ "الفلق" کی تفسیر کے سلسلہ میں حسبِ ذیل واقعہ بیان کیا ہے:۔

عن زینب امرأة عبد اللہ عن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول
ان الرقی والتمائم والتولة شرک۔ قالت: قلت لم تقول ھذا، واللہ لقد کانت
عینی تقذف فکنت اختلف الی فلان الیھودی یرقینی فاذا رقانی سکنت، فقال
عبد اللہ انما ذالک عمل الشیطان کان ینخسھا بیدہ فاذا رقا کف عنھا۔

(جلد ۳ صفحہ ۵۸۰)

حضرت زینبؓ حضرت عبداللہؓ کی زوجہ اپنے خاوند سے روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ جھاڑ پھونک یعنی دم کرنا اور گنڈے تعویذ شرک ہیں۔ حضرت زینبؓ نے انہیں ٹوکا کہ ایسا کیوں کہتے ہو۔ میری آنکھ بہتی تھی، تو میں فلاں یہودی کے پاس دم کرانے گئی، جب اس نے دم کیا تو میری تکلیف جاتی رہی۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ یہ شیطانی عمل تھا جسے وہ ہاتھ سے چھوتا تھا، جب دم کیا تو ہٹ گیا۔

قرآن کریم سراپا علم اور نور ہے۔ اس لئے اس نے اوہام پرستی کی ان تمام تاریکیوں کو مٹا دیا۔ علاوہ ازیں ہمیں کتب روایات میں ایسی احادیث ملتی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضورؐ نے بھی اس قسم کی توہم پرستیوں سے خصوصیت سے منع فرمایا تھا۔ مثلاً صحیح بخاری میں عمران بن حصین کی روایت کے بعد ایک طویل حدیث میں حضور صلعم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ امت محمدیہ میں سے ستر ہزار ایسے اشخاص بلا حساب جنت میں داخل کئے جائیں گے جن کی خصوصیات یہ ہوں گی:۔

فقال هم الذين لا يسترقون ولا يتطيرون ولا يكتوون وعلى ربهم يتوكلون۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الطب نمبر ۷۶۔ باب من لم یرق)

حضور صلعم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو دم نہیں کراتے اور بدشگونی نہیں لیتے اور نہ داغ دیتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:۔

عن عقبة بن عامر سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من تعلق تميمة فلا اتم الله له ومن تعلق ودعة فلا ودع الله له۔

(رواہ احمد۔ نیل الاوطار۔ جلد ۷ ص ۲۱۶)

عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ جس نے کوڑیوں کے تعویذ لٹکائے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مراد پوری نہ کرے اور جس نے ودعہ لٹکائے (اس کے معنے بھی کوڑیوں کے تعویذ ہیں) اللہ تعالیٰ اسے سکون نہ دے۔

ان روایات کے سلسلہ میں ہمارے سامنے وہ حدیث بھی آتی ہے جس میں حضور صلعم نے جھاڑ پھونک، تعویذ دھاگے کے تمام کاروبار کو شرک قرار دے دیا تھا۔ "قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان الرقى والتمائم والتولة شرك۔ رواه احمد وابوداؤد وابن ماجه والتولة ضرب من السحر قال الاصمعي هو تحبب المرأة الى زوجها۔ (ایضاً)" حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے ہوئے سنا کہ دم کرنا اور گنڈے تعویذ شرک ہیں۔ یہ حدیث مسند احمد، سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں آئی ہے۔ اور تولہ (جس میں گنڈے اور تعویذ دونوں کا مفہوم شامل ہے) جادو کی ایک قسم ہے۔ اصمعی کہتے ہیں کہ اس عمل سے عورت کو خاوند کے نزدیک زیادہ محبوب بنایا جاتا تھا۔ خیال رہے کہ ائمہ حدیث کے نزدیک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت صحیح ترین ہے۔ امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:۔

حدیث ابن مسعودؓ اخرجہٗ ایضاً الحاکم وصححہٗ ابن حبان۔ (ایضاً ۱۴۹) حضرت ابن مسعودؓ کی اس حدیث کو حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام ابن حبان نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

ان احادیث مقدسہ کی روشنی میں آپ سوچئے کہ خود نبی اکرم صلعم کے ارشادات کی رو سے جھاڑ پھونک گنڈا تعویذ وغیرہ کا مقام کیا قرار پاتا ہے۔ ہمیں (نام نہاد) ارباب طریقت سے تو بحث نہیں کہ وہ اپنے مسلک اور اشغال کی سند یہیں ہی کہیں اور سے لاتے ہیں لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں ارباب شریعت سے (بالخصوص مسلک اہل حدیث کے متبعین سے) کہ ان کے ہاں بھی تعویذ تاگے کا جو سلسلہ جاری رہتا ہے تو اسلام کی رو سے اس کا جواز کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری کتب روایات میں ایسی وضعی احادیث شامل کر دی گئی ہیں جن سے جھاڑ پھونک کا جواز نکلتا ہے اور انہی وضعی روایات پر یہ حضرات تکیہ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی تعلیم اور نبی اکرم صلعم کے ان ارشادات گرامی کی روشنی میں جنہیں ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس قسم کی روایات کے وضعی ہونے میں کیا شک و شبہ رہ جاتا ہے۔

[طلوع اسلام" اس موضوع پر طلوع اسلام میں متعدد بار تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے اس مقام پر کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۰ء کا مقالہ "قرآن کا مصرف" یا اکتوبر ۱۹۵۱ء کا مضمون "قرآن اور اس کا استعمال" ملاحظہ فرمالیں]

تنبیہ: سطح بین قارئین وہ ورد وظائف شروع نہ کریں۔ جنہیں اس مقالہ کے ابتدا میں درج کیا گیا ہے۔ وہ سب خرافات ہیں]۔

کاتب کی ضرورت

ادارہ طلوع اسلام کے لئے ایک معیاری (جز وقتی یا ہمہ وقتی) کاتب کی ضرورت ہے۔ معاملہ طے ہونے پر اجرت حسب منشاء دی جائے گی۔ خواہش مند حضرات جلد رابطہ قائم کریں۔ ملاقاتیں دفتر ادارہ میں ہر شام (بجز اتوار) ۵ بجے سے ۸ بجے تک ہو سکے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵-بی گلبرگ ۲ (متصل پولیس اسٹیشن گلبرگ)

لاہور میں قیام کے لئے پارک وے ہوٹل

PARK-WAY

صاف ستھرے، ادا کرنے مناسب شرح پر نیز عمدہ، لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے

معیاری طعام گاہ۔ آپ کی تشریف آوری کا شکریہ

فون ۵۰۲۵۱

منیجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن۔ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن سنہ ۱۹۷۴ء

مجلسِ مذاکرہ

قسط سوم

موضوع:
یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

۱۲- تحیہ فاروقی

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

محترم باباجی اور سامعین کرام

اکبر الٰہ آبادی کا اپنے مخصوص، منفرد اور شوخیانہ انداز میں کہ جس میں نہایت خوبصورتی سے تہذیب کے بظاہر حسین چہرے پہ ایک بھرپور طنزیہ طمانچہ ہوتا ہے یہ کہنا کہ:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اپنے ترقی پسند شجرِ تہذیب کی جڑوں کی اصل قوت و ماہیت کو افراد و اربابِ نظر کے سامنے لاتا ہے کہ اس تعلیم کا جو مثبت اندازِ فکر سے نوجوانانِ ملت کی نشوونما نہیں کر رہی ہے میٹھا زہر، جس کو وہ بے خبری میں پیتے چلے جا رہے ہیں کس قدر تباہ کن اور ضرر رساں ہے یعنی جس سے خون کا ایک بھی قطرہ بہائے بغیر پوری انسانیت قتل و غارت ہو جائے اور پھر یہ سب کچھ اس خاموشی سے ہو جائے جس طرح عزرائیل زمین پر رہتے بستے انسان کی روح قبض کر لیتا ہے۔

سامعین کرام! یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس قسم کا نظامِ تعلیم جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے نتیجے کے طور پہ ایک زندہ جاوید ہستی کی بجائے مردِ بیمار پیدا کر رہا ہے۔ اگرچہ سکول اور کالج کی دیواروں پہ آویزاں علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی تصاویر سے نوجوانوں کو قوم کے شاہین و عقاب ہونے کا شبہ ہوگا لیکن اگر آپ اس دانگرِ تعلیم پہ آئیں تو آپ کو زاغوں اور کرگسوں کی ایک دنیا نظر آئے گی جہاں ہماری قوم کے زاغ و کرگس زندگی کی پستیوں میں گرے اپنے مقام و مقاصد کو بھولے ایک نامعلوم منزل کی سمت بھاگ رہے ہیں۔ اور صاحبِ صدر! مجھے یہ کہنے دیجئے کہ اگر ذہنوں کی یہ کرگسیت ہمارے مردِ توانا کے اقوال و افعال سے ٹپکتی ہے تو صنفِ نازک بھی ایک طرف تو شرم و حیا کا اور دل آل پہنے ہوئے اور دوسری طرف غازہ و پاؤڈر کی تہیں جمائے ہوئے فسق و نفاق کا عملی مظاہرہ کئے ہوئی ہیں اور ہر دم کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اس ساز کے کسی ایک تار کو بھی چھیڑا جائے تو آواز یہ نکلتی ہے کہ ؎

ہے کہاں ساقی مرا اور جام و پیمانہ مرا ! کہہ رہی ہے میری خاموشی بھی افسانہ مرا

اور اس کے علاوہ بزرگانِ من آپ کا یہ نوجوان رمضان کے مہینے میں بھی، اور رمضان کو بھی، یوم الفرقان کو بھی مال روڈ پر زنانہ لباس میں ملبوس کھڑا سگریٹ کے کش لگاتا ہوا اپنے دوست سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ دوست یہ قائدِ اعظم نے بھی (خاکم بدہن) کیا بے وقوفی کی تھی کہ اسے ایک الگ مملکت کی سوجھ پڑی ۔ پاکستان بنا ڈالا، ہندو مسلم اکٹھے رہتے تھے، اچھے بھلے باہم پیار کے جلسے تھے اور اب اس کی غلطی کے نتائج ہم بھگت رہے ہیں ۔ اس نوجوان کو اپنے گھر کے مقصدِ تعمیر کے علاوہ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان پیار کے جلسوں میں ایک دوسرے سے نفرت و عداوت تھی وہ باہمی پیار نہیں تھا، وہ مسلسل پیکار تھی ۔ وہ حق و باطل کا ٹکراؤ تھا لیکن اپنے نوجوانوں کے اس اندازِ فکر سے یہ عیاں ہے کہ گزشتہ ۲۷ سال کے دوران یہ کوشش نہیں کی گئی کہ انہیں اپنے گھر کی تعمیر کا مقصد بتایا جاتا ۔ اس قسم کی صورت حال میں اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں ہی یہ کہنا چاہیے کہ:

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

سامعینِ کرام! اس قسم کے کالجوں کو آپ عہدِ رفتہ کے ان کلیساؤں کے مماثل قرار دے سکتے ہیں جہاں مذہبی تعلیم کی مقدس چادر میں لپٹی ہوئی بے حیائی جراثیم بڑھا رہی ہوتی ہے اور جہاں کے گھٹے گھٹے ہوئے ماحول میں قوتِ پرواز اپنے مثبت اندازِ فکر کی بجائے یکسر منفی اندازِ نظر لئے ہوتی ہے جہاں انسانی ذات کی ثمربار نشوونما کی صلاحیتوں کو ابھارنے نکھارنے کی بجائے اسے چلے ہوئے کارتوس کی مانند کر دیا جاتا ہے ۔ یہ وہ ادارے ہیں جہاں قوم کے معمار کی بجائے قوم کے بیمار پیدا ہوتے ہیں ۔ ایک تعلیمی ادارہ کہ جہاں خود کو پہچاننے کے علاوہ کائناتِ خارجی و داخلی کے اسرار و رموز سے آشنا ہونے کے علاوہ مقامِ مومن تک پہنچنا ہوتا ہے ۔ بے چارہ طالب علم زندگی کے ایک دوراہے پر کھڑا صدا دے رہا ہوتا ہے کہ ؎

مجھے اتنا بتا دیں، میں کہاں ہوں!

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب انگریزی تعلیم کا اثر ہے ۔ اردو کی گل و بلبل و زلف و عنبر کی شاعری، اور الف لیلوی داستانوں کا اثر ہے ۔ اس تاریخ کا اثر ہے جس میں اپنے عظیم بت شکن محمود غزنوی کو ہندوستان پر حملوں کا مقصد سیم و زر کا لالچ بتایا جاتا ہے ۔ اس لئے ان فسانوں کو خارج کر کے اسلامیات کو داخلِ نصاب کرنا چاہیئے ۔ اس چیز کے متعلق میں آپ کو اپنا ذاتی تجربہ بتاتی ہوں ۔ میٹرک کے بعد میں نے سوچا تھا کہ اسلامیات میں ایم ۔ اے کروں گی، لیکن ہوا یہ کہ ایف ۔ اے تک ہی اسلامیات پڑھنے کے بعد میں نے ایم ۔ اے اسلامیات کا ارادہ ترک کر دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ اسلامیات مجھے مروّجہ اسلام سے دور لے گیا اور میں نے سوچا کہ قرآن حکیم کا ذاتی طور پر مطالعہ کروں گی اور میری یہ انتہائی خوش بختی تھی کہ خدا نے میرے ذہن کے دریچوں کو اس شمسِ منیر کی کرنوں سے روشن کیا کہ جس کے فیض سے میرے قلب و ذہن میں اجالا ہو گیا ۔ اور یہی وہ بصیرت ہے جو قرآن کے اس صحیح مفہوم کو سمجھنے والوں میں وہ مستحکم کردار پیدا کرتی ہے کہ پھر جس کی خاک کے ذرّوں کے سامنے ستاروں کی چمک شرمندہ ہے ۔

صاحبِ صدر! غلط نظامِ تعلیم کی بنیادوں پر قائم شدہ یہ تعلیمی فیکٹریاں قوم کو ایسی پیداوار مہیا کرتی ہیں کہ جو بظاہر

جاندار معلوم ہوتی ہیں ۔ مگر خالی نیام کی طرح جواہر زندگی سے محروم ہوتی ہیں جو مقاصدِ حیات سے بے نیاز اپنے پراگندہ ذہنوں کے زندان میں محبوس قلب بے نور و رُو سیاہی کا مرقع ، قلب و نظر کے حلال و حرام سے بے پرواہ پستیٔ حیات کا نصیب لئے ہوئے زندگی گزار رہے ہوتے ہیں ۔ ان کے سانس لیتے ہوئے چہروں پر چھائی ہوئی مُردنی ، بے سکونی و غیر مستقل مزاجی ان کو کیا نشانِ منزل دے سکتی ہے لیکن وہ تعلیم کہ جس میں ابھرتی ہوئی نسلوں کو جدید تعلیم کے ساتھ اپنے دین کی عطا کردہ مستقل اقدار سے روشناس کرایا جاتا ہے تو اس سے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کے ساتھ زندگی کی شب تاریک میں آثارِ سحر کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں ۔ جن کے قلب و نظر میں مردِ مومن کی وہ اعلیٰ ترین خصوصیت اور تکمیلِ ذات کا قیمتی اصول ، تصورِ خودی ، موجود ہوتا ہے وہ خودی کہ جو باطل کی ہر طاقت سے ٹکرا کر کبریت و آفاقیت عطا کرتی ہے ۔ یہ وہ تعلیم ہے جو ہمیں طلوعِ اسلام سے ملی ہے ۔ یہ آبگینۂ حیات کی وہ شرابِ کہن ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا کہ :۔

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات　　وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات
وہ مے جس سے ہے سوز و سازِ ازل　　وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

جو عقل انسانی کو ادراک کی گہرائیوں میں لے جا کر اسرارِ حیات سے روشناس کراتی ہے ۔ تہذیبِ حاضر کے بے سوزِ جگر لالوں کو اقبال نے اپنی لو لئے پرسوز سنائی تھی کہ ۔

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا　　نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف !

اس لئے کہ خالقِ کائنات کی عطا کردہ صلاحیتیں اور قوتیں معاشرے کی منفعت کے لئے صرف ہو سکیں نہ کہ ان تو انائیوں سے انسانیت ہی کا گلا گھونٹ دیا جائے اور تاکہ اس سے وہ فکر پیدا ہو جو ایک طرف طائر فردوس تک کمندیں ڈالے اور دوسری طرف قلزم اسرار کے انکشافات زمانے کو دکھا دے جو تعقبِ آسمان کے تابندہ و درخشندہ شمس و قمر اور ستاروں و سیاروں کی دلربانہ حرکات کی اصل دلربائی کو وا کر دے اور جو حسن زمین کے سینے میں پوشیدہ بے تاب زندگیوں کو عالم مشہود میں لائے اور جب یہ فکرِ انسانی وحی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی طے کرتی ہو اس مقام تک پہنچے تو لات و منات و سومنات کو پاش پاش کرتی ہوئی ہر ضرب پکار اُٹھے کہ :

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (اور اللہ کی زمین اس کے نور سے جگمگا اُٹھے)

۱۳۔ عارفی سلطانہ

صاحبِ صدر اور معزز سامعین ۔ السلام علیکم ۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمارے آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے :۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

موضوعِ مذاکرہ پر مزید گفتگو کرنے کے لئے ضروری ہے کہ میں اس واقعہ کا قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لوں جس کی طرف شاعر نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ۔ قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے حق میں بہت جابر تھا وہ "يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ (۲/۴۹) تمہارے ابنا کو ذبح کر دیتے تھے

اور نساؤں کو زندہ رکھتے تھے"۔

عام طور پر اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو لڑکے پیدا ہوں انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔

لیکن "ذبح" کے معنی صرف مار ڈالنا نہیں بلکہ اس کے معنی ذلیل وخوار کرنا، کسی کو کمزور اور غیر مؤثر کر دینا، حقیر کر دینا بھی ہیں نیز کسی کو علم وتربیت سے محروم رکھنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور بنی اسرائیل کے معاملہ میں "ذَبح" سے مراد یہ ہے کہ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں ذلیل وخوار، حقیر، کمزور، غیر مؤثر بنانا اور صحیح تعلیم وتربیت سے محروم رکھنا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ اگر تمام لڑکے قتل کر دئے گئے ہوتے اور صرف لڑکیاں زندہ رکھی جاتیں تو وہ قوم اتنی کثیر تعداد میں کس طرح باقی رہ سکتی تھی؟

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَھُمْ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ فرعون اپنی رعایا میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا۔ ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح قوم کا وہ طبقہ جس میں اسے جوہر مردانگی نظر آتے انہیں دباتا اور حقیر وذلیل رکھتا اور جس طبقہ کو دیکھتا کہ ان میں وہ جوہر نہیں انہیں ابھار کر معزز ومقرب بنا لیتا اور ان کے ہاتھوں انہی کی قوم کا گلا گھونٹتا۔ اس طرح وہ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو کمزور کئے جا رہا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن کے مقابلے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو منتخب کیا گیا اور انہیں کہا گیا۔

اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (۲۰/۲۴)

اے موسیٰ تو فرعون یعنی بادشاہِ مصر کی طرف جا وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔

"اس ارشاد خداوندی کے مطابق حضرت موسیٰؑ، فرعون اور اپنی قوم کی طرف گئے۔ ان کے ارادوں کی اطلاع بنی اسرائیل اور فرعون دونوں کو ہوئی تو فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور ان کی آمد کا مقصد خود جاننا چاہا۔ آپ نے بتایا کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں اور ان کا مطالبہ فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پر مجبور نہ کیا جائے انہیں حضرت موسیٰؑ کے حوالہ کر دیا جائے تاکہ وہ انہیں انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر خدا کی محکومیت میں لائیں اور اس طرح انہیں انسانیت کی زندگی سے روشناس کرائیں"۔

مصری بت پرست قوم تھے انہوں نے مختلف صفات باری تعالیٰ کے لئے مختلف دیوتا مقرر کر رکھے تھے جیسے بارش برسانے والا دیوتا۔ اولاد دینے والا دیوتا۔

جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میں تمہارے رب کی طرف سے پیامبر ہوں تو فرعون نے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ "اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے؟"

حضرت موسیٰؑ نے کہا۔ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس کی راہنمائی کی (۲۰/۴۹)

فرعون چاہتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کو اہل دربار اور عوام سے لڑوا دے۔ اس لئے اس نے ان سے پوچھا۔ ان کا کیا حال ہے جو پچھلے زمانوں میں گزر چکے ہیں (۲۰/۵۱) اس کا مقصد یہ تھا عوام سے کہے کہ یہ شخص تمہارے

واجب الاحترام بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ اس طرح ان کے جذبات کو بھڑکا کر انہیں موسیٰ کا مخالف بنا دے۔

لیکن حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اسلاف کا علم میرے پروردگار کو ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کو اس طرح کے لفظی گورکھ دھندے میں نہیں الجھایا جا سکتا، تو وہ استہزا پر اتر آیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں) لیکن حضرت موسیٰؑ نے بتایا کہ میرا خدا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے۔ جب فرعون سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو وہ کہنے لگا کہ یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ دیوانہ۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی اس تنقید سے پھر بے رخی کا برتاؤ کیا اور اپنا مقصد بیان کرتے رہے۔ فرعون نے جب دیکھا کہ اس کے دعوے ربوبیت کی یوں پے در پے دھجیاں بکھری جا رہی ہیں تو کھسیانا ہو کر حضرت موسیٰؑ کو ڈرانے دھمکانے لگا۔ عوام کے جذباتِ اسلاف پرستی کو ابھارا اور اپنی قوم کو یہ کہہ کر خاموش کروا دیا کہ کیا ہم اپنے ہی طرح کے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔ حالانکہ ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔

اب اس قوم پر عذاب کے چھوٹے چھوٹے دھچکے آنے شروع ہوئے تاکہ وہ اس سے عبرت حاصل کر کے راہِ راست پر آ جائیں اور ہلاکت و بربادی کے بڑے عذاب سے بچ جائیں لیکن فرعون اور اس کی جماعت سرکشی میں بڑھتی چلی گئی اور وہ قرآن کے الفاظ میں بنتے ہی "قومًا مجرمين" ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا (۲۳/۴۴) جب ان کی تباہی کا آخری وقت آ پہنچا تو حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ قوم بنی اسرائیل کو فلسطین کی ارضِ مقدس کی طرف لے جاؤ۔

لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے فرعون کی حاکم قوم اس کی کب اجازت دے سکتی تھی کہ وہ محکوم قوم ان کے ہاتھوں سے نکل جائے۔ ادھر بنی اسرائیل نے یہاں سے نکلنے کی تیاریاں شروع کیں۔ ادھر قوم فرعون انہیں روکنے کی تدابیر سوچنے لگی۔ بنی اسرائیل راتوں رات نکلے لیکن قوم فرعون نے ان کا تعاقب کیا۔ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو لے کر سمندر کے پار چلے گئے لیکن فرعون سمندر میں غرق ہو گیا۔

فرعون تباہ ہو گیا اور بنی اسرائیل اس کے پنجۂ استبداد سے نکل کر سینا کی وادیوں میں جا پہنچے۔ اب یہاں سے ان کی زندگی کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ کا مقام تھا یعنی غلامی و محکومی کی زنجیروں کو توڑنا۔ اب اگلی منزل سامنے آئی یعنی اپنی ملی تنظیم و تعمیر۔

پہلا مرحلہ تو حضرت موسیٰؑ کے تصدق آسانی کے ساتھ طے ہو گیا لیکن اس دوسرے مرحلے میں سب کچھ انہیں خود کرنا تھا۔ حضرت موسیٰؑ انہیں قوانین دے رہے تھے۔ ان پر چلنے کی ہدایات بھی بتا رہے تھے لیکن وہ ان میں زبردستی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تبدیلی بنیادی اور نفسیاتی تبدیلی تھی۔ اس کے لئے انہیں خود کوشاں ہونا تھا۔

اس مرحلے میں عزم و استقلال، مسلسل جد و جہد، پیہم سعی و عمل، سپاہیانہ زندگی، سیرت کی پختگی،

ارادوں کی بلندی نہایت ضروری تھی۔ اس لئے یہ مرحلہ بنی اسرائیل کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔ فرعون نے نہ صرف ان کے ابناء کو ہی ذبح نہیں کیا تھا۔ اس نے باقی ماندہ قوم میں بھی جوہر انسانیت کو مُردہ کر دیا تھا۔ ان کے سینے زندہ آرزوؤں اور نگاہیں بلند مقاصد کو کھو چکی تھیں۔

ان کی آنکھوں کے سامنے اتنے بڑے دشمن کی ایسی تباہی و بربادی ہوئی۔ سینا کے وسیع و عریض میدان رہنے کے لئے، کھلی فضا، صاف آب و ہوا، فراخ زمین، من و سلویٰ کھانے کو، سر پہ بادلوں کا سایہ، پیچھے طور کی سنگین دیوار حفاظت کے لئے، حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی راہنمائی کے لئے۔ لیکن اس پر شکر گزار ہونا تو ایک طرف مطمئن بھی نہیں تھے۔

جہاں کوئی معمولی سی دشواری راستے میں حائل ہوتی یوں بگڑ کر بیٹھ جاتے، گویا انہیں بیگار میں پکڑے جا رہے ہیں بات بات پر منہ بسور لیتے کہ تم ہمیں عجیب مصیبت میں کھینچے لئے جا رہے ہو۔ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ جب حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال کر لے چلے ہیں تو سمندر کے کنارے پہنچ کر انہوں نے پھر چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں کس موت کی طرف دھکیل کر لے آئے ہو۔ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا۔ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہے۔"

پھر یہی نہیں کہ کہیں کسی ایک مقام پر گھبرا کر ایسا کہہ دیا ہو۔ وہ ہر مقام پر ایسا ہی کہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں واقعی دل تاسف تھا کہ مصریوں کی محکومیت سے کیوں نکل آئے۔

پانی ملنے میں کچھ دیر ہوئی تو پھر حضرت موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے اس لئے نکال لایا ہے کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور مواشی کو پیاس سے ہلاک کر دے۔

دراصل انہیں محکومی کی تن آسانی، سہل انگاری کی زندگی جس میں سوچ اور تفکر کا فقدان تھا بہت مرغوب تھی اس لئے وہ قدم قدم پر روٹھ جاتے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟

سینا کی وادیوں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بت کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ پرانی عادتیں جو ان کی دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھیں پھر سے بیدار ہو گئیں۔ حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے اور فرمائش کی کہ ہمیں بھی ایک ایسا ہی بت بنوا دیجئے۔ "پرانی عادت"

اور آگے بڑھئے۔ جب حضرت موسیٰؑ طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے اور حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لئے چھوڑ گئے تو ان میں ایک شخص سامری بھی تھا۔ اس نے بنی اسرائیل سے سونے چاندی کے زیورات لئے جو وہ مصر سے اپنے ساتھ لائے تھے اور جو اب اس صحرائی تمدن کی زندگی میں ان کے لئے وبال بنے ہوئے تھے۔ اس نے ان زیورات کو گلا کر ایک بچھڑا سا بنایا۔ اس بچھڑے کے خالی پیٹ میں کوئی ایسی کل بٹھا دی جس سے آواز نکلتی تھی۔ بس اب کیا تھا بنی اسرائیل جوق در جوق لپکے اور اس بچھڑے کی پرستش کرنے لگے۔ سونے اور چاندی کی پرستش۔

حضرت موسیٰؑ انہیں صحرا میں لئے گھوم رہے تھے کہ کسی طرح تعلیم و تربیت سے انہیں شہری تمدن کی آسانی

کی زندگی کی جگہ سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا جائے لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی طرح کے کھانے پر قناعت کریں پس اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ ہمارے لئے وہ تمام چیزیں پیدا کر دی جائیں جو زمین کی پیداوار ہیں۔ سبزی، ترکاری، گیہوں، دال، پیاز، لہسن وغیرہ

حضرت موسیٰؑ نے یہ سن کر کہا کیا تم چاہتے ہو کہ ایک غذا کی لذت کے لئے قومی آزادی و سعادت کے مقصد عظیم سے دست بردار ہو جاؤ جس میں بڑی ہی خیر و برکت ہے۔

یہی نہیں انہوں نے ایک اور مطالبہ بھی حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیش کر دیا۔ جب انہوں نے کہا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دئیے ہیں تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ ہم جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں اس پر ایمان کیسے لے آئیں اور یہ کس طرح مان لیں کہ یہ احکام خدا کی طرف سے ہیں۔

ایک اور واقعہ سنئے جب کسی قوم سے عمل کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو اس کے پاس فقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں زندہ قوموں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ادھر کوئی حکم ملا۔ ادھر اس پر عمل ہو گیا۔ نہ کوئی حجت نہ بہانہ، نہ بحث نہ جدل۔ انہیں اپنے کام سے غرض ہوتی ہے اور بس۔ لیکن مردہ قومیں جن میں عمل کی قوت ختم ہو جاتی ہے، تو وہ زندگی کے ہر شعبے میں شاعری شروع کر دیتی ہے اور نظری مسائل میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔

یہی حالت بنی اسرائیل کی تھی۔ مصریوں کی دیکھا دیکھی گائے کی عقیدت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ (۲/۹۳)

اس جذبہ کو ختم کر دینے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ ان کے "معبود" کو خود ان کے ہاتھوں ذبح کرایا جائے انہیں گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ بجائے اس کے کہ سیدھی طرح اس پر عمل کرتے۔ لگے طرح طرح کی کٹ حجتیاں کرنے پہلے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے تم ہمارے ساتھ تمسخر کر رہے ہو۔ پھر کہنے لگے کہ ہمیں بتاؤ اس کا رنگ کیسا ہے۔ اس کی عمر کیا ہے۔ غرض طرح طرح کے بہانے کرنے کے بعد بمجبوراً گائے کو ذبح کیا۔

حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ فلسطین کی ارض مبارک اللہ تعالیٰ نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور جا کر اس پر قبضہ کر لو۔ لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعف خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ ایک مدت کی غلامی نے جرأت و جسارت، ہمت و حوصلہ کے تمام جوہر سلب کر لئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ خدا کے ساتھ تھے میں انہیں انسانوں سے ڈر لگ رہا ہے۔

بنی اسرائیل نے جواب میں کہا۔ اے موسیٰؑ اس سرزمین میں بڑے ہی زبردست لوگ رہتے ہیں۔ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں! اگر وہ لوگ وہاں سے خود ہی نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی تُل گئے ہو تو تم اور تمہارا بھائی دونوں جاؤ۔ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے تم وہاں لڑتے رہنا۔ جب آپ دشمنوں کو مغلوب کر لیں گے تو ہمیں آواز دے دینا۔ ہم فوراً آ جائیں گے۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں کہیں بھاگ نہیں جاتے۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کسی قوم کی اجتماعیت اور مرکزیت برباد ہونے کا سب سے بڑا سبب کیا

ہے - اس کا سبب اس کے باہمی اختلافات ہوتے ہیں - یہ اختلافات کسی اصول پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ محض باہمی ضد اور تعصب کی بنا پر ہوتے ہیں - انہوں نے پیغام خداوندی کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اپنے علماء و مشائخ کی وضع کردہ شریعت کو عین دین سمجھ رکھا تھا - یہی ان کی تباہی کا موجب تھا -

باہمی اختلافات کے علاوہ ان کی یہ حالت تھی کہ اپنی ساری قوتیں اپنی تعمیر کی بجائے دوسروں کی تخریب و تکذیب میں صرف کرتے تھے -

دنیا میدانِ سعی و عمل ہے - یہاں زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی تڑپ ہو - آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو - لیکن جس قوم میں قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیتی ہے کہ انہیں کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں - وہ خدا کی چہیتی قوم ہے نہ اس پر کوئی مصیبت آسکتی ہے نہ عذاب طاری ہو سکتا ہے یہی حالت یہود کی ہو چکی تھی - ان کا دعویٰ تھا کہ ہم اللہ کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں - عاقبت میں بھی کوئی عذاب سوائے چند دنوں کے ہمیں نہیں چھو سکتا -

یہ لوگ اندھی تقلید کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ اپنے جمود اور بے حسی پر بھی فخر کرتے تھے -

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ -

سامعین کرام ! یہ تھا مختصر سا بیان بنی اسرائیل کے ان حالات کا جو ان کی صحیح تعلیم و تربیت میں مانع تھے آپ نے ان مثالوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ انسان کو انسانیت کے اونچے مقامات تک پہنچنے کے لئے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور کتنی محنت کرنی پڑتی ہے - بیرونی استبداد اور خوف ، یہ بیرونی اثرات ہیں جو اس کی تکمیل کے راستے میں حارج ہو سکتے ہیں -

لیکن اگر کوئی شخص ، یا قوم بیرونی خطرات سے مامون ہو بھی جائے تو بھی وہ تکمیل ذات کے اعلیٰ مدارج تک اپنی سعی و کوشش کے بغیر نہیں پہنچ سکتی - یہ سب سے دشوار مرحلہ ہوتا ہے - اس میں سہل انگاری ، تن آسانی ، ضد ، تعصب ، خود فریبی جیسے دام ہائے خوش رنگ سے رہائی حاصل کرنے کے بعد ہی تکمیل ذات کی بلند منزل تک پہنچا جاتا ہے -

اکبر الٰہ آبادی فرماتے ہیں ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

لیکن میرے خیال میں ذبح صرف کالج میں نہیں کیا جاتا - کالج کے باہر بھی بہت سے ذبح خانے ہیں جہاں انسانیت جلا دی جاتی ہے فرعون کو کالج کی تو نہ سوجھی لیکن وہ دوسری قتل گاہوں سے بخوبی واقف تھا اور اس نے اس میں قتل کرکے بنی اسرائیل کی جو ذہنیت بنادی تھی وہ میں نے آپ کے سامنے ابھی ابھی پیش کی ہے -

ویسے بھی ہمارے ملک کی کل آبادی کا صرف ۱۰ فی صد حصہ پڑھا لکھا ہے اور باقی مکتب کے فیض سے ناآشنا ہے اس ستر فیصد حصہ کو چھوڑ کر باقی قوم کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں - در اصل قصہ یہ ہے کہ ہر زمانے کے فرعون کسی نہ کسی رنگ میں دوسروں کو اپنا محتاج رکھنا چاہتے ہیں ان کے پیکر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کی روح نہیں بدلتی - اقبال کے الفاظ میں ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں　　　اگرچہ پیر ہے آدم ، جواں ہیں لات و منات

شاہکار رسالت

عمر فاروق

(اپنے انداز کی منفرد کتاب)

اکثر سوالات ابھرتے ہیں کہ:۔

- اسلام کا معاشرتی، تمدنی، عسکری، سیاسی، معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ ۔۔۔۔۔ اور اس کا انداز کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:۔

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
- اب پھر اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکر قرآن جناب **پرویز** کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور گہری فکر کا نتیجہ ہے۔

- نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوٰئے ماموریت اور ختم نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل اضخیم۔ سفید کاغذ، مضبوط جلد، جاذب نگاہ گرد پوش۔

قیمت:۔ /45 روپے (علاوہ محصولڈاک)

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور